مولانا محمد علی جوہر نمبر

جاری شدہ ۱۹۲۲ء

علامہ نیاز فتحپوری

نگارِ پاکستان



مدیر

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

رجسٹرڈ ایس نمبر ۲۲۷۲ جاری شدہ ۱۹۲۲ء
تعلیمی اداروں کیلئے محکمہ تعلیم کراچی سے منظور شدہ سرکلر نمبر ڈی/ایف یو پی/۳۶۶۹

بانی
علامہ نیاز فتحپوری

مولانا محمد علی جوہر نمبر

نگار پاکستان

مدیر
ڈاکٹر فرمان فتح پوری

معاونین

کامل القادری . . . . ریاض صدیقی
امراؤ طارق . . . . فردوس حیدر

ناظم نشرو اشاعت و اشتہارات - رشید محمد قریشی

دفتر
۶۰ - ورلی روڈ - گارڈن ایسٹ - کراچی ۳
فون: ۲۱۹۹۶۸
سید اختر حسین نے ایجوکیشنل پریس سے چھپوا کر ۱۵۹-اے قمر کتاب گھر اردو بازار سے شائع کیا

فہرست مضامین

۵۷ واں سال	نومبر دسمبر ۱۹۷۸ء	شمارہ ۱۱-

ملاحظات

اشارات

تبرّکات

خطبات

جواہرات

نظرات

نوادرات

تاثرات

نگار پاکستان

کا آئندہ شمارہ جوہر نمبر حصہ دوم ہوگا

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

ملاخطات

اونیسویں صدی کے آخری پچاس سال مسلمانانِ پاک و ہند نے سرسید احمد خاں اور رفقائے کار کی رہنمائی میں بسر کئے ہیں۔ سچ بات یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمان، جس قسم کے سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی پستی کا شکار ہو گئے تھے۔ اگر سرسید احمد سامنے نہ آجاتے اور بعض عملی اقدام کے ذریعے انھیں سہارا نہ دیتے اور انھیں من حیثیت القوم باعزت زندگی گزارنے کا سلیقہ نہ سکھاتے تو برصغیر میں آج ان کی حیثیت اچھوتوں سے زیادہ نہ ہوتی۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سرسید اور ان کے رفقاء کے فوراً بعد اگر چند سرپھرے نوجوان سامنے نہ آجاتے اور ان کے چھوڑے ہوئے کام کو آگے نہ بڑھاتے تو سرسید احمد نے ۱۸۷۰ء کے لگ بھگ جو قومی خواب دیکھا تھا وہ شرمندہ تعبیر نہ ہوتا۔ ان سرپھرے نوجوانوں میں مولانا محمد علی جوہر مولانا ظفر علی خاں، قائداعظم محمد علی جناح مولانا حسرت موہانی اور علامہ اقبال خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اس لئے کہ بیسویں صدی عیسوی کی سیاسی و ملی تحریکوں میں یہی پیش پیش رہے ہیں اور انھیں کی دیوانگی یا فرزانگی کے زیر اثر پاک و ہند کے مسلمانوں نے اپنی زندگی بسر کی ہے۔

(۱) یہ پانچوں بزرگ اونیسویں صدی کی آٹھویں دہائی یعنی ۱۸۷۰ء اور ۱۸۸۰ء کے درمیان پیدا ہوئے اس لئے اگر ان کے فکر و عمل میں ایک گونہ مماثلت و مشابہت نظر آئے تو چنداں تعجب کی بات نہیں۔ لیکن اس گروہ کے سرخیل مولانا محمد علی جوہر قرار پاتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ سیاست و صحافت

اور ادب و ثقافت کی سطح پر اوّل اوّل وہی نمودار ہوئے اور سب سے پہلے ایک ملّی رہنما کی حیثیت سے ان ہی کو شہرت حاصل ہوئی۔

مولانا محمد علی جوہر کی زندگی بڑی پہلو دار تھی۔ وہ صحافی بھی تھے ادیب بھی، شاعر بھی تھے خطیب بھی، مبصر بھی تھے اور سیاسی رہنما بھی اُن کی تقریر و تحریر دونوں میں جادو کا اثر تھا۔ وہ جتنا اچھا بولتے تھے اتنا ہی اچھا لکھتے تھے۔ غور و فکر کی عادت اُن میں مطالعہ سے پیدا ہوئی تھی لیکن قومی جذبہ اور مذہبی جوش، ان کو قدرت نے عطا کیا تھا پاکستان و ہندوستان کی جنگِ آزادی کے وہ پہلے سپاہی ہیں جو برطانوی سامراج کے کھلے دشمن تھے۔ انھوں نے اپنے اصول و قواعد کے خلاف کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا وہ اپنی ذہانت و قابلیت کی بدولت جاہ و منصب کی جس بلند چوٹی پر چاہتے پہنچ جاتے۔ لیکن انھوں نے وطن کی آزادی اور مسلمانوں کی عزّت کی خاطر اپنے آپ کو یکسر بھلا دیا تھا۔ وہ اسلام کے سچے شیدائی تھے اور مسلمانوں کی محبت سے کچھ اسقدر سرشار و سرمست تھے کہ دوسروں کے سوا اپنے متعلق انھوں نے کبھی کچھ سوچا ہی نہیں۔

مولانا محمد علی جوہر انگریزی اور اردو دونوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ اردو میں ان کی شاعری، اُن کے خطوط، اور ہمدرد کے مزاحیہ کالم اور اداریے، اُن کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ ان کا یہ شعر:۔

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے — اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

تو ضرب المثل بن گیا ہے۔ لیکن یہی ایک شعر نہیں اُن کے درجنوں اشعار ایسے ہیں جو ان کے نام کو دنیائے شاعری میں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لئے ہے — پر غیب سے سامانِ بقا میرے لئے ہے
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے — یہ بندہ دوعالم سے خفا میرے لئے ہے
کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف — کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے
کیوں ایسے نبی پر نہ فدا ہوں کہ جو فرمائے — اچھے تو سبھی کے ہیں بُرا میرے لئے ہے

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے　　　میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد
لذّت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں　　　آتا ہے لطفِ جرمِ تمنا سزا کے بعد

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیّت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

خوگر جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی
اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی
کشورِ کفر میں کعبے کو بھی شامل کر لو
سیرِ ظلمات کو تھوڑی سی فضا اور سہی

یادِ وطن نہ آئے ہمیں کیوں وطن سے دور
جاتی نہیں ہے بوئے چمن کیا چمن سے دور

یہ حالت ہو گئی ہے ایک ساقی لنے نہ ہونے سے
کہ خم کے خم بھرے ہیں مے کے اور میخانہ خالی ہے

ہوں لاکھ نظر بند، دعا بند نہیں ہے
اللہ کے بندوں کو نہ اس طرح ستا دیکھ

یہ اشعار یہ ثابت کرتے ہیں کہ جوہر صرف شاعر نہیں ایک ممتاز و منفرد شاعر ہیں انھوں نے حمد و نعت کو غزل کے رنگ روپ سے اور غزل کو مردانگی اور انسانیت کے ایسے لب و لہجہ سے ہم کنار کیا جس کی مثالیں اردو شاعری میں بہت کم ملتی ہیں۔ ان کی غزلیں طرزِ احساس کے اس نئے پن سے عبارت ہیں۔

جسے آج کی غزل کا طرۂ امتیاز خیال کیا جاتا ہے یہ الگ بات ہے کہ ان کی شخصیت کے قوی تر جوہروں نے ان کی شاعرانہ جوہر کو پوری طرح بروئے کار آنے کا موقع نہ دیا اور خود ہمارے ادیبوں اور ناقدوں نے بھی اس کی طرف سے بے اعتنائی برتی ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اردو شاعری میں اس خاص لہجے کے بانی اور نمائندہ ہیں جس کے واضح نشانات یگانہ چنگیزی کے یہاں ملتے ہیں۔ ہر چند کہ اُن کی زندگی کا زیادہ حصہ عملی سیاست میں گزرا۔ جب تک رہے سیاسی و ملّی تحریکوں کو عملاً آگے بڑھاتے رہے۔ شعر و شاعری کی طرف باقاعدہ توجہ کرنے کی ان کو فرصت نہیں ملی۔ پھر بھی انھوں نے جو کہا ہے اور جیسا کہا ہے وہ اردو شاعری کی تاریخ میں مولانا جوہر کا نام زندہ رکھنے کیلئے بہت ہے۔ مولانا جوہر کی شاعری کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ایک طرف وہ حوصلہ مند جذبوں سے لبریز ہے دوسری طرف اس میں زندگی اور ادب کے رشتوں کا گہرا شعور بھی ملتا ہے انھوں نے جو کچھ کہا ہے بظاہر غزل کے مروجہ پیرائے میں کہا ہے لیکن معنوی حیثیت سے ان کی غزلوں میں ایسا تسلسل و تفکر نظر آتا ہے کہ ان کی شاعری روایت سے بغاوت کی ایک خوبصورت مثال بن گئی ہے۔

اردو کی طرح انگریزی زبان و ادب پر بھی ان کی دسترس غیر معمولی تھی۔ انھوں نے انگریزی میں ایسی مہارت حاصل کر لی تھی کہ بہت سے انگریز صحافی اور ادیب بھی ان کی انگریزی پر رشک کرتے تھے۔ جو انگریز افسر ادھر سے لندن جاتے تھے وہ محمد علی جوہر کے انگریزی مضامین دوسروں کو دکھانے کے لئے لے جاتے تھے۔ لکھنے کی طرح انگریزی بولنے پر بھی انھیں عجیب و غریب مہارت تھی۔ برطانیہ کے مختلف شہروں اور مختلف علاقوں میں جو انگریزی بولی جاتی ہے وہ تلفظ اور لہجے کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ محمد علی جوہر کا کمال یہ تھا کہ وہ شہریوں سے لے کر دیہات تک۔ عالموں سے لے کر جاہلوں تک، عوام سے لے کر خواص تک

اور سرمایہ داروں سے لے کر مزدوروں تک، سب کے انگریزی لہجے پر انھیں قدرت حاصل تھی۔

VI مولانا جوہر خود بھی انگریزی کے شاعر اور ادیب تھے۔ ساتھ ہی انھیں انگریزی شاعروں کے ہزاروں اشعار یاد تھے، انگریزوں کے نہ جانے کتنے مزاحیہ کالم، لطیفے، جملے، ضرب المثل اور ڈراموں کے ٹکڑے ازبر تھے۔ اور ان سب کا استعمال وہ اپنی تحریر و تقریر میں بڑے قرینے سے اور برجستگی سے کرتے تھے۔ طبیعت میں سنجیدگی فکر کے ساتھ ساتھ شوخی و بذلہ سنجی بھی بلا کی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے مزاحیہ کالموں اور انگریزی طنزیہ تحریروں کا سکہ اسی وقت جما لیا تھا جب ۱۹۰۴ء میں انھوں نے الہ آباد سے ایک مختصر سا رسالہ "گپ" نام کا نکالا تھا۔ انگلستان سے واپسی پر ۱۴ر جنوری ۱۹۱۱ء میں کلکتہ سے ہفتہ وار اخبار "کامریڈ" نکالا تو ان کی انگریزی اور انگریزی مقالات کی دھوم مچ گئی . . . . . ملک کے باہر یورپ تک ان کا نام مشہور ہوا۔

"کامریڈ" کی حکمت عملی، برطانوی حکمرانوں کے خلاف تھی اس لئے آخر آخر انگریز اسے اپنا جانی دشمن خیال کرنے لگے تھے۔ لیکن اس کے ابتدائی برسوں میں برصغیر کے سارے انگریز افسران اسے بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے تھے۔ خود وائسرائے ہند اور ان کی بیگم اسے لطف لیکر پڑھتے تھے اور اگر کامریڈ کے پہنچنے میں تاخیر ہو جاتی تو بے تابی سے پوچھتے رہتے تھے کہ پرچہ کب آیا ہے۔ کامریڈ کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگائیے کہ جب ہندوستان کے وزیر مالیات ڈوولسن انگلستان واپس جانے لگے تو کامریڈ کے پرانے پرچوں کا بہت بڑا صندوق بھی ساتھ لے گئے۔ مولانا جوہر نے ان سے پوچھا کہ آخر ان پرچوں کو لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ انگلستان میں "لندن پنچ" کے ایڈیٹر کو دکھاؤنگا کہ انگریزی

کس طور پر لکھی جاتی ہے۔ یہ تو مولانا جوہر کی غیر معمولی انگریزی قابلیت کا نتیجہ تھا کہ ان کے مخالفین حتیٰ کہ ان کے جانی دشمن انگریز تک "کامریڈ" کی تحریروں کے قائل تھے ورنہ جہاں تک ان تحریروں کے موضوعات اور موضوعات کے لب ولہجہ کا تعلق ہے وہ شروع سے آخر تک انقلابی اور باغیانہ تھا۔

انھوں نے جو کچھ لکھا، مسلمانوں کی آزادی، اسلام کی برتری۔ اور برطانوی ظلم وستم کی مدافعت میں لکھا اور برملا و بے باکانہ لکھا۔ چنانچہ صحافت وسیاست دونوں میں وہ ۱۹۱۲ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک برصغیر کے مسلمانوں کے میر کارواں تھے۔ ان کے لفظ وقلم میں ایسی قوت تھی کہ وہ پوری قوم کا رخ جس طرف چاہتے تھے پھیر دیتے تھے۔ آزادیِ وطن کی ہر سیاسی تحریک، مسلم لیگ و کانگریس سے لے کر خلافت و ترک موالات سب میں وہ رکن مجلس نہیں میر مجلس کی حیثیت سے شریک رہے ہیں۔ ان کے زور قلم کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران جس وقت انھوں نے ترکوں کی طبی امداد کے لئے کامریڈ میں ایک پرزور اپیل شائع کی تو اس اپیل پر کامریڈ کے دفتر میں روپیہ پانی کی طرح برسنے لگا۔

مولانا جوہر کی تحریریں، ان کے مخالفوں خاص طور پر برطانوی حکمرانوں پر بجلیاں بن کر گرتی تھیں۔ وہ کبھی کامریڈ کو بند کرنے کا حکم صادر کرتے تھے کبھی پریس کی ضبطی کا نوٹس دیتے اور مولانا کو قید وبند کی صعوبتوں میں ڈالنے کی دھمکی دیتے ایک بار نہیں انگریز حکمرانوں نے بارہا ایسا کیا کہ انھیں بڑی کٹھن آزمائشوں میں ڈالا مگر مولانا جوہر کبھی حق گوئی سے دست بردار نہ ہوئے۔ ہمیشہ وہی لکھتے رہے جسے سچ سمجھتے اور وہی کرتے جسے مسلمانوں کے حق میں مفید جانتے۔ جیسے جیسے اُن پر حکومت کی سختیاں بڑھتی جاتیں ویسے ویسے ان کا قلم حکمرانوں کے حق میں شمشیر بن جاتا۔ چنانچہ پہلی جنگ عظیم کے دوران جب برطانوی اخبار لندن ٹائمس میں THE CHOICE OF TURKS کے عنوان سے

ترکوں کے خلاف یہ حقارت آمیز مقالہ شائع ہوا کہ ترکوں کو اگر زندہ رہنا ہے تو انھیں برطانیہ کے خلاف کوئی قدم اٹھانے گریز کرنا چاہیئے تو مولانا جوہر کو اس دھمکی پر جلال آگیا۔ انھوں نے اسی عنوان سے کامریڈ میں تمیش کالموں پر مشتمل ایک پرزور مقالہ لکھا۔ اس مقالے میں انھوں نے لندن ٹائمس کے مقالہ نگار کو ایسا منھ توڑ جواب دیا کہ حکومت اور ارکان حکومت دونوں تلملا اٹھے۔ اور حق گوئی و بے باکی کا انھیں وہی انعام ملا جو دنیا کے سامنے حق پرستوں اور سچائی کے متوالوں کا مقدر رہا ہے۔ کامریڈ بند کر دیا گیا۔ پریس ضبط ہوا اور مولانا کو قید با مشقت کے ساتھ جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ یہی نہیں ان کی طرف سے ایک جعلی خط بنا کر ان پر یہ الزام لگایا کہ انھوں نے افغانستان کے حکمرانوں کو ہندوستان پر حملہ کرنے اور انگریزوں کو یہاں سے نکال بھگانے کی دعوت دی تھی۔

لیکن اس قید و بند کا مولانا کی طبیعت پر کوئی اثر نہیں ہوا اُن کے جنونِ عشق کے انداز وہی رہے جو پہلے تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ انگریزوں کے ظلم و ستم نے انھیں اپنے عزم اور ارادے میں کچھ اور پختہ کر دیا۔ وہ جب تک رہے مجاہدینِ تحریکِ آزادی کے سپہ سالار بنے رہے۔ بات یہ ہے کہ مولانا جوہر ملّی اور قومی جذبوں سے کچھ ایسا سرشار تھے کہ مسلمانوں کی توہین کسی صورت گوارا ہی نہیں کر سکتے تھے۔ رزم و بزم، خلوت و جلوت ہر جگہ وہ مسلمانوں کی توقیر و ناموس کا تحفظ کرتے تھے۔

مولانا محمد علی جوہر نے مسلمانوں کی آزادی اور ناموس کے تحفظ کو اپنی زندگی کا مشن بنا رکھا تھا۔ یہ مشن ان کی زندگی میں بظاہر کامیاب نہ ہوا لیکن اس سے کون انکار کرے گا کہ آج ہم پاکستان کے نام سے جس آزاد مملکت کے مالک ہیں اس کی تاسیس و تخلیق میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے اتنا بڑا حصہ ہے کہ برصغیر کی ملّتِ اسلامیہ انھیں کبھی بھلا نہیں سکتی اور

یہی وجہ ہے کہ آج اُن کی وفات کے تقریباً پچاس سال بعد بھی اُنکا ماتم ہر جگہ برپا ہے۔

"نگار" اور بانیٔ نگار علامہ نیاز فتح پوری نے شروع سے مولانا جوہر کی شخصیت و کردار اور جوشِ ملی و سیاسی تدبر سے دلچسپی لی ہے۔ اس اعتبار سے قارئین نگار کا رشتہ، مولانا جوہر سے بہت استوار ہے، چنانچہ ضروری خیال کیا گیا کہ جیسے اس سے پہلے معاصرین جوہر کی صدیوں کے موقعوں پر نگار نے، حسرت موہانی، قائدِ اعظم اور علامہ اقبال پر نمبر شائع کئے۔ اسی طرح جوہر صدی کے موقع پر بھی نگار کی ایک اشاعت مخصوص کی جائے۔ بحمد اللہ یہ کام تکمیل کو پہنچا۔ اور اب جوہر نمبر قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ اس میں کیا ہے اور اس کی کیا اہمیت ہے اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ البتہ اتنا ضرور کہوں گا اس میں جو کچھ ہے وہ تقریباً سب کا سب میرے ذاتی ذخیرۂ کتب سے ماخوذ ہے اور مولانا جوہر کے سلسلے میں بیش قیمت بھی ہے اور نایاب بھی۔ مثلاً اس میں :-

۱۔ مولانا جوہر کی وفات پر علامہ اقبال کا وہ قطعہ ہے جو ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں
۲۔ بی اماں کا وہ تاریخی خطبہ ہے جو انھوں نے ۱۹۲۴ء میں سیلون کے کانگریس ہال میں دیا
۳۔ مولانا جوہر کی وہ خود نوشت ہے جو انھوں نے ۱۹۲۷ء میں لکھی تھی۔
۴۔ مولانا جوہر کی آخری تقریر ہے ۵۔ ہمدرد کا الوداعی اداریہ ہے۔
۶۔ مولانا جوہر کی پہلی تصنیف مطبوعہ ۱۹۰۷ء کا ایک نایاب ورق ہے۔
۷۔ مقدمہ کراچی کی جیوری کے سامنے مولانا جوہر کا بیان ہے۔
۸۔ روداد چمن کے عنوان سے مولانا کا ایک نایاب طویل مقالہ ہے۔
۹۔ مولانا جوہر کی آخری دعا ہے۔
۱۰۔ معاصر ادیبوں کے نایاب و نادر مقالات ہیں۔
۱۱۔ ہم عصر شعراء کی نظمیں اور قطعات تاریخ ہیں۔

لیکن یہی کچھ نہیں ہے اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ شاید ایک نمبر اور نکالنا پڑے میں شکر گزار ہوں اپنے دوستوں کا خصوصاً کامل القادری، ریاض صدیقی، امراؤ طارق اور فردوس حیدر کا جن کی والہانہ رفاقت و اعانت کے سبب یہ نمبر بروقت منظرِ عام پر آسکا اور مجھے قارئین نگار کیساتھ ساتھ مولانا جوہر کی روح کیسامنے سرخرو ہونیکا موقعہ ملگیا۔ فرمان فتحپوری

انصار علی

آئینۂ جوہر

۱۰ر دسمبر ۱۸۷۸ء	:-	پیدائش بمقام رامپور
۲۰ر اکتوبر ۱۸۸۰ء	:-	والد عبدالعلی خاں کی وفات
مارچ ۱۸۸۸ء	:-	جنرل محمد اعظم خاں کے انگریزی طرز کے اسکول میں داخلہ
۱۸۹۰ء	:-	بریلی ہائی اسکول میں داخلہ، داغ سے ملاقات، علی گڑھ اسکول میں داخلہ۔
۱۸۹۴ء	:-	ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکٹ (میٹرک) میں کامیابی اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں داخلہ۔
ستمبر ۱۸۹۸ء	:-	علی گڑھ سے بی۔اے کیا اور اعلیٰ تعلیم کیلئے ولایت روانگی
نومبر ۱۸۹۹ء	:-	اکسفارڈ میٹرک میں کامیابی۔
جنوری ۱۹۰۲ء	:-	وطن واپسی اور عظمت علی خاں کی بیٹی سے شادی، بی۔اے کے امتحان کے لئے اکسفارڈ روانگی۔بی۔اے (اکسفارڈ) میں کامیابی، وطن واپسی اور علی گڑھ کالج میں لکچرار کی اسامی کے لئے درخواست، ریاست رامپور میں بحیثیت ایجوکیشن آفیسر تقرر۔
۱۹۰۳ء	:-	بروداسول سروس میں تقرر۔
۱۹۰۶ء	:-	آل انڈیا مسلم لیگ کے اوّلین تشکیلی اجتماع میں شرکت اور اس کی روئداد مرتب کرکے اشاعت۔
۱۹۰۷ء	:-	اُن کے سلسلہ مضامین مطبوعہ "ٹائمز آف انڈیا" کی کتابی شکل میں بعنوان Thoughts on

اشاعت Present Discontent

۱۹۰۸ء :۔ محمد علی جوہر کے دوست گیکواڑ فتح سنگھ پرنس آف
بردوہ کی وفات۔

۱۷ر جنوری ۱۹۱۱ء :۔کلکتہ سے انگریزی ہفت روزہ "کامریڈ" کا اجراء

۱۹۱۲ء :۔جنگ بلقان میں ترکی کی ہزیمت ، انڈین میڈیکل مشن
کی روانگی ، ڈاکٹر آزاد انصاری مشن کے قائد تھے۔اور
شعیب قریشی وخلیق الزماں بھی اس میں شامل تھے۔

۱۳ر اکتوبر ۱۹۱۲ء :۔دہلی سے "کامریڈ" کا اجراء

۱۹۱۳ء :۔روزنامہ "ہمدرد" کا دہلی سے اجراء

جولائی ۱۹۱۳ء :۔انڈین میڈیکل مشن کی واپسی۔

ستمبر ۱۹۱۳ء :۔ایک پمفلٹ Come To Mecedonia
And HELP Us

کی ضبطی اور مولانا محمد علی جوہر کا ضبطی کے خلاف مقدمہ
مقدمہ میں فتح یابی۔اسی سال مولانا محمد علی جوہر چوری
چھپے لندن گئے تاکہ مسلم وفد متعلقہ مسجد کانپور
کی رہنمائی کرسکیں۔

۲۰ر ستمبر ۱۹۱۴ء :۔"کامریڈ" میں حشر آفریں اداریہ
Choice of The Turks کی اشاعت

۱۹۱۵ء :۔رامپور کے بعد مہرولی میں مولانا محمد علی جوہر کی
نظر بندی اور پھر چھندواڑہ میں منتقلی۔

ستمبر ۱۹۱۵ء :۔ریشمی خط کا مقدمہ

۱۹۱۶ء :۔لکھنؤ پیکٹ

دسمبر ۱۹۱۷ء :۔مولانا محمد علی کو جب وہ نظر بندی کے ایام میں تھے

"آل انڈیا مسلم لیگ" کا صدر منتخب کیا گیا اوران کی
قدآدم تصویر کرسی صدارت پر رکھ کر جلسے کی کارروائی
کا آغاز کیا گیا۔

۸؍جون ۱۹۱۹ء	:۔ مولانا محمد علی جوہر کی چھندواڑہ سے بیتول جیل میں منتقلی
دسمبر ۱۹۱۹ء	:۔ رہائی
یکم فروری ۱۹۲۰ء	:۔ مولانا محمد علی کی قیادت میں "خلافت وفد" کی یورپ روانگی جس میں دیگر لوگوں کے علاوہ مولانا سید سلیمان ندوی، سید حسین اور ابوالقاسم بھی شامل تھے۔
۱۳؍اکتوبر ۱۹۲۰ء	:۔ خلافت وفد کی واپسی
جون ۱۹۲۱ء	:۔ آل انڈیا خلافت کانفرنس منعقدہ کراچی کی صدارت
ستمبر ۱۹۲۱ء	:۔ مولانا محمد علی کی گرفتاری اور کراچی مقدمہ، جیوری کے سامنے مولانا کا اعلان حق، دو سال قید با مشقت
ستمبر ۱۹۲۳ء	:۔ مولانا محمد علی کی رہائی اور آل انڈین نیشنل کانگرس کی صدارت۔
۱۱؍مارچ ۱۹۲۴ء	:۔ مولانا محمد علی کی لاڈلی بیٹی آمنہ کی وفات
ستمبر ۱۹۲۴ء	:۔ مسٹر گاندھی کی رہائی اور مولانا محمد علی جوہر کے مکان (دہلی) پر قیام، ۲۱ دنوں کا برت
۲۲؍جون ۱۹۲۴ء	:۔ خلافت کانفرنس منعقدہ دہلی کی ورکنگ کمیٹی میں شرکت، مولانا محمد علی کے علاوہ اس میٹنگ میں شوکت علی، اجمل خاں، ابوالکلام آزاد، عبدالقادر آزاد، ڈاکٹر انصاری، عبدالمجید، ٹی۔ اے۔ کے شیروانی، ظہور احمد، شعیب قریشی اور محمد شفیع بھی شریک ہوئے تھے۔

۳۱ر اکتوبر ۱۹۲۴ء	:۔ دہلی سے "کامریڈ" کا دوبارہ اجراء
نومبر ۱۹۲۴ء	:۔ دہلی سے "ہمدرد" کا دوبارہ اجراء۔ بی اماں (آبادی بانو بیگم) کی وفات
۲۲ر جنوری ۱۹۲۶ء	:۔ "کامریڈ" پر پابندی۔ "موتمر عالم اسلامی" میں شرکت کے لئے انتخاب
۲۰ر مئی ۱۹۲۷ء	:۔ "ہمدرد" پر پابندی
مئی ۱۹۲۸ء	:۔ علاج کے لئے لندن روانگی
دسمبر ۱۹۲۸ء	:۔ لندن سے واپسی، اور کانگرس نے جب نہرو رپورٹ کو قبول کر لیا تو مولانا محمد علی نے اس سے استعفیٰ دیدیا
مارچ ۱۹۲۹ء	:۔ دورۂ برما
۱۹۳۰ء	:۔ مولانا محمد علی کی شدید علالت اور شملہ میں علاج معالجہ وائسرائے ہند کی دعوت برائے شرکت پہلی گول میز کانفرنس مولانا محمد علی کی آمادگی اور لندن روانگی۔
۱۹ر نومبر ۱۹۳۰ء	:۔ گول میز کانفرنس میں مولانا محمد علی نے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔
۳ر جنوری ۱۹۳۱ء	:۔ مولانا محمد علی نے وزیر اعظم برطانیہ کو ایک طویل خط لکھا، جس میں انھوں نے کہا کہ مسلمان ایک قوم ہے، ہندوستان کی دوسری اقلیتوں کی نظر سے اسے نہ دیکھا جائے۔
۴ر جنوری ۱۹۳۱ء	:۔ مولانا محمد علی صبح سوا نو بجے (لندن ٹائمز) وفات پاگئے
۲۴ر جنوری ۱۹۳۱ء	:۔ مولانا محمد علی کی ارضِ مقدس میں تدفین، عالم اسلام نے وداعی تقریب میں شرکت کی اور آخری نماز جنازہ جوارِ مقدس میں پڑھی گئی،

قلمی چہرہ

مولانا محمد علی

خواجہ حسن نظامی

میانہ قد موٹا جسم، نمکین بشرہ، گول اور خوب بھاری بھر کم چہرہ آنکھیں معمولی مگر ان کے اندر کشش دار تیزیاں، آواز بلند گرجدار مگر زیادہ بولنے کے بعد تھک کر بیٹھ جاتی ہے۔ رام پور کے رہنے والے ہیں۔ قوم عشق باز یعنی شیخ، سید، مغل، پٹھان اور برہمن کھتری، دلیش، شودر، سے بالاتر۔ عمر آجکل چالیس کے قریب ہے قیامت تک زندہ رہیں گے مگر قیامت کے بوریئے نہیں سمیٹیں گے

تین بھائی ہیں بڑے بھائی شوکت علی ہیں۔ ایک بھائی کا نام ذوالفقار علی ہے وہ قادیانی ہوگئے ہیں۔ گویا ماں باپ کی یہ تین یادگاریں ہیں۔ اور تینوں دین و قوم و ملک پر قربان ہیں۔

محمد علی کی انگریزی لیاقت تمام مسلمانانِ ہندوستان میں اعلیٰ و برتر مانی جاتی ہے۔ مگر عشق باز فرقہ کہتا ہے کہ محمد علی کی قومیت انگریزیت کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ ان کے دل کی خوبی سارے ہندوستان میں ممتاز ہے۔ اور مسلمان لیڈر تو ایک بھی ان کے دل کی برابری نہیں کر سکتا۔

ہندوستان میں قومی و سیاسی خدشات انہی دونوں بھائیوں نے پیدا کیئے ہیں۔ اور انہی کی محنت سے مسلمان قوم میں بیداری پیدا

ہوئی۔

محمد علی کا مزاج اپنے بڑے بھائی شوکت علی کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی شوکت علی میں برداشت کا مادہ بہت زیادہ ہے۔ محمد علی جلدی مشتعل ہو جاتے ہیں۔ مگر باوجود اس اختلافِ مزاج کے آپس میں دونوں بھائی عاشق و معشوق کی طرح محبت رکھتے ہیں۔

محمد علی کا مزاج شاہانہ ہے۔ جب وہ نوکری کرتے تھے، ایڈیٹری اور لیڈری کا خواب و خیال بھی نہ تھا۔ تب بھی بادشاہوں کا حوصلہ خرچ کرنے میں تھا۔ نماز روزہ کی پابندی شروع ہی سے ہے۔ قوم کی رہنمائی محض علمی لیاقت یا لکھنے بولنے سے نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے دل درکار ہے۔ یہی وجہ کہ دوسرے ممتاز مسلمان لیڈروں کے مقابلے میں محمد علی کو فوقیت ہے۔ ان کے ساتھ جس شخص نے دو دن بسر کئے، وہ ان کا عاشق و شیفتہ بن گیا۔ دوسرے لیڈروں کا یہ حال ہے کہ ملاقات کرنے اور ہم نشینی کے بعد دل ان سے بیزار ہو جاتے ہیں، کیونکہ ان کے اندر خود غرضیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ محمد علی میں خود غرضی بالکل نہیں ہے۔ اور کچھ ہے تو بس اتنا کہ قوم و ملک کا بھلا چاہتے ہیں۔ اور چونکہ خود بھی قوم و ملک کا ایک حصہ ہیں۔ اس واسطے ضمناً اپنا بھی بھلا چاہتے ہیں۔

محمد علی کی خانگی زندگی بہت پُر لطف ہے۔ اس میں روکھا پن نہیں ہے۔ نہ وہاں رعونت خود پسندی پائی جاتی ہے۔ نہ بناوٹی ملنساری۔ وہ بڑے وضعدار ہیں جس سے جو برتاؤ شروع ہو جائے تو آخر دم تک نباہنے کا خیال رکھتے ہیں۔ اور یہی اصلی مشرق میں ہونا چاہیئے۔

(پیام۔ کلکتہ ۱۱ر جنوری ۱۹۳۱ء)

زندگی کے پچاس سال

(خود نوشت مولانا محمد علی جوہر)

(۱۵ر ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ کو رئیس الاحرار کی عمر پچاس سال کی ہو گئی تھی اس موقعے پر آپ نے "ہمدرد" (مورخہ ۱۷ر جون ۱۹۲۷ء) میں ایک مضمون لکھا تھا جو تبرکاً و تیمناً درج کیا جاتا ہے)

جس خالق نے مجھے ۱۵ر ذی الحجہ ۱۲۹۵ھ کو پیدا فرمایا تھا۔ اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آج بتاریخ ۱۵ر ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ میں میں نے اپنی عمر کے پچاس سال پورے کئے۔ اس پوری مدت پر نظر ڈالتا ہوں تو عجب خیالات دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ ۱۷ر رمضان المبارک ۱۲۹۷ھ کو میرے والد نے بعارضہ ہیضہ کوئی تیس بتیس سال کی عمر میں وفات پائی اس وقت میری والدہ مرحومہ کی عمر ستائیس اٹھائیس سال کی تھی۔ سوائے قرآن پاک کے کچھ نہ پڑھا تھا۔ اسی کی مدد سے خود اردو کا بین السطور ترجمہ پڑھنے کی استعداد پیدا کر لی تھی۔ والد نے تیس بتیس ہزار کا قرضہ چھوڑا تھا۔ اور پانچ لڑکے اور ایک لڑکی، جن میں سے سب سے بڑے کی عمر ۱۳ر سال کی تھی جو تین برس ہی کی عمر میں مرگی کے موذی مرض میں مبتلا رہے اور سب سے چھوٹا میں خود تھا جس کی عمر اس وقت پونے ۲ سال کی تھی۔ مجھے اپنے والد مرحوم بالکل یاد نہیں۔ مگر والدہ مرحومہ کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ علاوہ اس فیض گراں مایہ کے جو شوکت صاحب کی محبت، نگرانی اور ترغیب و تحریص کی بدولت مجھے نصیب ہوا ہے۔ میں جو کچھ ہوں اور جو کچھ میرے پاس ہے، وہ خداوند کریم نے مجھے اسی مرحومہ کے

ذریعے سے عطا فرمایا ہے۔ والد مرحوم کی وفات کے دن سے خود گھر کی بوڑھی ماماؤں کا سا سادہ اور سستا لباس پہنا اور انہی کی طرح روکھی سوکھی کھا کر گذر کی۔ مگر ہمارا کوئی سوال رد نہیں کیا۔ اور ہمیں اُس عیش و آرام میں رکھا پالا اور بڑا کیا جو ہمارے ان چچاؤں کی اولاد کے عیش و آرام سے کسی طرح کم نہ تھا۔ بلکہ کچھ زائد ہی تھا جو بفضلِ تعالیٰ والد مرحوم کی وفات کے وقت زندہ اور سلامت تھے جن کی جائدادوں پر قرضہ کا وہ بوجھ نہ تھا۔ جو ہمارے ترکہ پر تھا۔ اور جو ریاست رامپور میں بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز تھے۔ ان سب سے پہلے ہمیں کو گھر سے نکال کر بریلی اسکول میں تعلیم کے لئے والدہ مرحومہ نے بھیجا اور وہ سب تو اسکول چھوڑ چھوڑ کر گھر چلے گئے۔ مگر ہماری تعلیم جاری رہی اور شوکت صاحب جس طرح ریاست رامپور کے باشندوں میں سے غالباً سب سے پہلے کسی ہندوستانی یونیورسٹی کے گریجویٹ ہوئے، اسی طرح ان میں سب سے پہلے آکسفورڈ کا گریجویٹ میں ہوا۔ میرے سب سے بڑے چچا جو ہماری جائداد کا انتظام فرمایا کرتے تھے۔ اور ریاست میں ایک بہت بڑے عہدہ پہ ممتاز تھے۔ اس وقت زندہ تھے۔ جب میں ان کے سب سے چھوٹے مرحوم بھائی کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا اور ایک بیوہ کا پرورش کردہ اسی ریاست میں ان سے بھی بڑے عہدہ پہ مقرر کیا گیا۔ تو انہوں نے مجھے اس اعزاز پہ گلے لگا لیا۔ اور پیار کیا۔

ریاستہائے رامپور اور بڑودہ میں اچھے خاصے عہدوں پہ ملازمت کرنے اور جو خدمتیں تفویض ہوتی رہیں انہیں نیکنامی کے ساتھ بجالانے اور چند اور ریاستوں میں ان سے بھی اعلیٰ عہدوں کے دیئے جانے مگر مجبوری قبول نہ کرسکنے کے بعد میں نے دنیائے صحافت میں قدم رکھا۔ اور ملک و ملت کی

خدمت کے لئے اس شعبۂ زندگی میں داخل ہوا۔ آج یہ کہنا مشکل ہے کہ خدمات کی انجام دہی میں نیکنامی حاصل کی یا بدنامی، لیکن غالباً یہ تو آج بھی نہ کہا جائے گا کہ گمنام رہا۔ مسلمانوں کی سب سے پہلی نمائندہ سیاسی انجمن یعنی مسلم لیگ کی ۱۹۰۶ء میں بنیاد ڈالی اور ۱۹۱۷ء میں اس کا صدر منتخب ہوا۔ گو قید فرنگ کی بدولت کرسی صدارت پر میری تصویر ہی "جلوہ افروز" ہوئی۔ اس عزت فزائی کے باعث انجمن کا آج تک مشکور ہوں۔ مگر میری نظر میں جو اس کی حقیقت تھی۔ وہ اسی زمانے کے اس شعر سے واضح ہوتی تھی۔

یہ صدر نشینی ہو مبارک تمہیں آپ بر
لیکن صلۂ روزِ جزا اور ہی کچھ ہے

پانچ سال کی نظر بندی اور قیدی سے رہائی پر ۱۹۲۰ء میں جمعیت خلافت کی طرف سے ایک وفد کا سرکردہ ہو کر یورپ جانا۔ اور وزرائے برطانیہ فرانس و اطالیہ و پاپائے روم سے ملنا پڑا۔ پھر دو سال کی قید سخت کی سزا بھگتی اور اس کے بعد ۱۹۲۳ء میں ہندوستان کی سب سے بڑی نمائندہ سیاسی جماعت انجمن انڈین نیشنل کانگریس کی صدارت کے لئے باتفاق رائے انتخاب ہوا۔ ۱۹۲۶ء میں سب سے پہلے عالم اسلامی اسلام کی موتمر کے لئے بھی مسلمانانِ ہندوستان کی نمائندگی کے لئے جمعیت خلافت کی طرف سے منتخب ہوا۔

زہے سعادتِ آں بندہ کہ کرد نزول
گہے بہ بیتِ خدا و گہے بہ بیتِ رسول

گو موتمر کا دوسرا اجلاس حج کے موقعے پر مکہ معظمہ میں منعقد نہیں کیا گیا لیکن موتمر کی شاخ ہند کی طرف سے اس کے لئے بھی بلا اختلاف منتخب ہوا۔ ان مناصب کے متعلق جو فرائض تھے انہیں نیکنامی سے انجام دیا، یا بدنامی نصیب

ہوئی، یہ نہیں کہہ سکتا، مگر یقیناً گمنام نہیں رہا۔

لیکن نہ یہاں کا نام مطلوب ہے، نہ یہاں کی نیک نامی، جو کچھ مطلوب ہے وہ وہی "صلۂ روزِ جزا" جس کا ۱۹۱۷ء کے انتخابِ صدر کے بعد کے شعر میں ذکر ہے۔ دیکھئے وہاں کیا ملتا ہے۔

کیا نہ ہوگی میری ہی حاجت روا
جس کا مولا قاضی الحاجات ہے
اس کی رحمت پر ہو جس کا آسرا
اس کو کیا حزن و غم آفات ہے
لے چلے ہیں اسکی رحمت کا یقیں
اپنی تو صاحب یہی اوقات ہے

خود خدا شاہد ہے کہ جب سے ہوش سنبھالا ہے اس پر اور اس کے رسول پر ایمان ہے۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ بدبختی سے:-

"ان کو مانا ہے پہ کہنا نہیں مانا ان کا"

ہزاروں گناہ کئے ہیں، فرائض مذہبی کی ادائیگی میں لاکھوں کوتاہیاں ہوئی ہیں تاہم اس رحیم وکریم کا شکر ہے کہ اسلام کی مصائب میں شریک کرکے آنکھیں کھولدیں اور اپنے گمراہ بندے کو راست پر لایا۔ ممکن ہے کہ اب بھی یہ وسوسہ شیطانی ہی ہو اور پھر وہی حالت ہو جس کے متعلق غالب نے لکھا ہے:-

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

لیکن دل تو کہتا ہے کہ جس کے نام نامی پر میرے والدین نے میرا نام رکھا تھا اسی کے طفیل مجھ پر بھی کرم ہوا۔ اور مجھ سے بھی اس ذات گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کا چاہنے والا فرما رہا ہے کہ الم یجدک یتیماً فاوی، جتنا سوچتا ہوں، وہی حقیقت

معلوم ہوتی ہے جو بحالت نظر بندی سپرندوارڈہ میں ان اشعار میں ظاہر کی گئی تھی :۔

یہ نظر بندی تو نکلی ردِ سحر
دیدہ ہائے ہوش اب جاکر کھلے
اب کہیں ٹوٹا ہے باطل کا طلسم
حق کے عقدے اب کہیں مجھ پر کھلے
اب ہوا ہے ماسوا کا پردہ فاش
معرفت کے اب کہیں دفتر کھلے
فیض سے تیرے ہی اے قیدِ فرنگ
بال و پر نکلے قفس کے در کھلے

کیا یہ جائز نہیں کہ میں بھی اپنے ہمنام علیہ السلام کے طفیل میں آج جبکہ مجھے پیدا ہوئے نصف صدی گذر چکی ہے اپنے دل کی ڈھارس بندھاؤں کہ ۔ للآخرۃ خیرٌ من الاولیٰ ۔
اور اس غزل کا مقطع بھی سچ ہو جائے ۔کہ :۔

جیتے جی تو کچھ نہ دکھلایا مگر
مرکے جوہر آپ کے جوہر کھلے

جب میں دس بارہ سال کا لڑکا تھا ۔ تو خیال کیا کرتا تھا کہ پچاس سال کا آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے ، اور بڑھاپے میں اٹھنے بیٹھنے ، چلنے پھرنے ، کھانے پینے میں دوسروں کی مدد لینا پڑتی ہے اور دوسروں کا دست نگر ہونا پڑتا ہے ۔ اسلئے میری آرزو تھی کہ خدا کرے پچاس برس کی عمر سے پہلے ہی موت آجائے ، تاکہ سسک سسک کر اور پلنگ پر پڑے پڑے ایڑیاں رگڑ کر مرنا نہ پڑے ۔ آج پچاس سال کا ہو گیا مگر اب تک موت نہیں آئی ، حالانکہ جس سال سے میدان صحافت میں قدم رکھا ہے ذیابطیس جیسے موذی اور مہلک مرض میں مبتلا ہوں ، اور جو راحت و آرام ، سکون و بے فکری ،

اس کا مقابلہ کرنے کے لئے درکار ہیں۔ وہ مفقود ہیں۔ اس وقت تک جتنی عمر ہوئی ہے اس کا آخری تہائی حصہ اس مرض میں گذرا ہے، اعضا میں اب قوت باقی نہیں ہے۔ حافظہ بحد خراب ہو گیا ہے۔ لیکن بحمد اللہ اب تک دوسروں کا دست نگر نہیں ہونا پڑا، اٹھنے، بیٹھنے، چلنے پھرنے، کھانے پینے میں ابھی دوسروں سے مدد لینے کی ضرورت نہیں پڑی، اور گو سال گذشتہ میں ۴ مہینے صاحب فراش بھی رہا تب بھی ملک و ملت کے کاموں میں شرکت کی اور بیٹھے بیٹھے بلکہ لیٹے لیٹے بھی وہ خدمات انجام دیتا رہا۔ جو کانگریس اور خلافت کے سلسلے میں مجھ سے متعلق تھیں۔ اسی حالت میں حج و زیارت کا شرف بھی نصیب ہوا، اور گو اسی دن جس دن موتمر عالم اسلام نے رسمی افتتاح کے بعد اپنا اصلی کام شروع کیا، آدھے جسم پر بے حسی پیدا ہو گئی۔ اور وہ بھی قلب والے آدھے حصے میں، اور میں سمجھا کہ اللہ میاں نے اپنے گھر بلا کر ہمیشہ کیلئے مہمان نوازی فرمائی۔ مگر موت نصیب ہو کر جنت المعلیٰ میں سونا نصیب نہ ہوا، دوسرے ہی دن سے موتمر کے جلسہ میں شریک ہوا، اور جو کچھ ہو سکا کیا۔ اس کے ختم ہوتے ہی زیارتِ روضۂ رسول کے لئے نکلا تو راستہ میں وہ درتبل نکلا جس سے خیال ہوا کہ شاید اسی سوراخ سے ملک الموت تشریف لانے والے ہیں۔ اور جنت المعلیٰ کی جگہ جنت البقیع میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے مہمانداری کا سامان کرایا جائے گا۔ مگر جو موت مکہ معظمہ میں نصیب نہ ہوئی تھی وہ مدینہ میں بھی میسر نہ آئی البتہ مولوی ثناء اللہ صاحب نے بندھا ہوا ہاتھ مدینہ منورہ سے واپسی پر دیکھ پوچھا۔ تو غالب کے غیر مطبوعہ کلام میں سے یہ شعر سنانا پڑا کہ :-

موت انکی ہے جو بس مر کے وہیں دفن ہوئے
نہ ندگی ان کی جو اس کوچے سے گھائل آئے

نہ معلوم ہمارے قبہ و قبر شکن بھائی اس موت کے قائل ہیں یا نہیں جو مرف

انہیں کا حصہ ہے۔ جو بس مر کے وہیں دفن ہوئے۔ لیکن میں تو اس قبہ و قبر شکنی پر بھی اس کا قائل ہوں۔ اور نیز اس زندگی سے جو ان کا حق ہے، جو اس کوچے سے گھائل آئے۔ میں کہ بحمد اللہ اس کوچے سے گھائل ہو کر آیا ہوں۔ باوجود روز افزوں ملکی و ملی و ذاتی مصائب کے آج ۱۵ر ذوالحجہ ۱۳۴۵ھ تک اس زندگی کا لطف اٹھا رہا ہوں۔ جو اس کوچے سے گھائل آنے والوں کو عنایت ہوتی ہے۔ اور اس کوچے کی خاکروبی کی خدمت جہاں تک ہو سکتا ہے اس دورِ افتادگی کی حالت میں بھی کرتا ہی رہتا ہوں۔ چاہے کسی اور بھائی کو جو وہاں سے گھائل ہو کر نہیں آیا ہے۔ پسند آئے یا نہ آئے۔ جس کے طفیل میں یہ زندگی نصیب ہوئی ہے۔ اس کے طفیل میں اس ذات پاک سے جس کے ہاتھ میری جان ہے۔ التجا ہے کہ اگر اس کوچے ہی میں ایک مشت استخواں کے لئے دو مشت خاکِ پاک نصیب ہو جائے تو بڑا کرم ہوگا۔ لیکن اگر اس سعادت سے محروم رہوں۔ تب بھی یہ تو آج حکم ہو جائے کہ جس بندہ کا نام محمد اور علی کے اسمائے گرامی پر آج سے پچاس سال پیشتر ہم نے رکھوایا تھا۔ اس کو اب جتنے دن اور جینا ہے محمد اور علی ہی کے دین کی خدمت کے لئے جلایا جائے۔ تاکہ ہر روز روزِ عید ہر شب شب برات ہو۔ کیونکہ ؎

دن وہی ہے ہمارے عید کا دن
جو تری یاد میں گذرتا ہے!

(از روزنامہ انقلاب ۲۵ر جنوری ۱۹۳۱ء)

مولانا محمد علی جوہر

روداد چمن

(سیاسی سرگزشت)

("ہمدرد" دورِ دوم میں مولانا محمد علی نے رودادِ چمن کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین لکھنا شروع کیا۔ جس کی چار اشاعتیں ۱۰ر جنوری ۱۹۲۹ء، ۱۳ر جنوری ۱۹۲۹ء، ۱۴ر جنوری ۱۹۲۹ء اور ۱۵ر جنوری ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئیں۔ یہ مضامین فی الحقیقت مولانا محمد علی کی سرگزشت پر مشتمل ہیں۔ انہوں نے ذرا فاصلے سے اپنے اور اپنے ہم رکاب رفیقوں کے کردار کا جائزہ لیا ہے۔ اس سلسلۂ مضامین کو پیشِ نظر رکھے بغیر کوئی محقق نہ مولانا محمد علی کی سیاسی جدوجہد کا اُس کے حقیقی تناظر میں ادراک کر سکتا ہے اور نہ کانگرس کے چھوٹے بڑے اُبھرتے لیڈروں کی ریشہ دوانیوں کا احساس کر سکتا ہے (نگار)

۱۰ر جنوری ۱۹۲۹ء

بالآخر کلکتہ کا اجتماع منتشر ہو گیا۔ جلوس نکل چکے۔ جلسے ختم ہو گئے۔ کل جہاں چراغاں تھا، آج وہاں دودِ شمعِ کشتہ کا نشاں بھی مشکل ہی سے نظر آ رہا ہے، اب دھواں دھار تقریریں ہو چکیں۔ ع اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

کل تک برقیات سے اخباروں کے کالم پُر ہوتے تھے۔ آج وہ بھی ایک حد تک پھر خالی نظر آنے لگے۔ بظاہر ع بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے

ملک و ملت سے ایک عرصہ تک چھٹے رہنے کے بعد ایک خادمِ قوم و وطن جو اُفتاں و خیزاں وطن سے رختِ سفر باندھ کر عازمِ غربت ہوا تھا کہ جسمِ فگار کا علاج کرائے۔

پھر وطن کو اُفتاں و خیزاں واپس آیا ہے اور اب رُوح کو فگار پاتا ہے۔ اور اس کے علاج کا محتاج ہے۔ طبعی طور پر وہ غربت کی شکایت کرتا، مگر کس مُنہ سے غربت کی شکایت کرے، جب بے مہریٔ یارانِ وطن کا یہ عالم ہے کہ اگر وطن سے دُور دیارِ غیر ہی میں مارا جاتا تو کم از کم اس کی بیکسی کی شرم تو رہ جاتی۔ میں آج پھر وطن میں ہوں، مگر اس غربت کی بابت کیا کہا جائے کہ دیارِ غیر سے زیادہ خود اپنے وطن میں غریب الوطن ہوں! اُنھیں کانوں سے جن سے آج اپنی ہجو سُن رہا ہوں، اپنی تعریف میں ہزاروں قصیدے بھی کبھی سُن چکا ہوں۔ ان عجیب و غریب تجربوں کے بعد سوائے اس کے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ؎

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں، پر صحبت مخالف ہے
جو گُل ہوں تو ہوں گلخن میں، جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

ملک و ملت کی خدمت کا آغاز اپنے پُرانے کالج مدرسۃ العلوم مسلمانانِ علی گڑھ کو جامعہ اسلامیہ بنانے کی کوشش اور مُسلم لیگ کی بُنیاد ڈالنے سے کیا تھا۔ پھر جریدہ نگاری شروع کی اور "کامریڈ" و "ہمدرد" کو جاری کیا۔ جب عالمِ اسلامی پر پیہم مصیبتوں کا نزول ہونے لگا تو "خدامِ کعبہ" کی بُنیاد ڈالی[1]۔ جنگِ طرابلس کے زمانہ میں مظلوم ترکوں کی اعانت و امداد کے لیے فنڈ کھولا۔ جنگِ بلقان میں خودکشی کرتے کرتے بچا تو طبّی وفد کو چتالجہ اور درِ دانیال[2] کو روانہ کیا۔ جنگِ عمومی میں پہلے اپنے پریس کی وہ ضمانت ضبط کرائی جو کانپور کی مسجد کے شہید کیے جانے اور اُس کی صدائے احتجاج بلند کرنے پر طلب کی گئی تھی۔ اور پھر خود بھی، نظر بند، اور بعد میں جیل خانہ میں قید ہو گیا۔

اس قید و بند کے زمانے میں میرے رُفقائے کار نے مجوزہ مُسلم یونیورسٹی کو کُلیۃً حکومت اور حکومت پرستوں کے حوالے کر دیا اور مارلے منٹو اصلاحات کے زمانہ کے جُداگانہ

---

[1] شوکت علی کے نام سے معنون ہے، لیکن وہ کون سا کام بغیر مولانا محمد علی کے مشورے کے کرتے تھے۔ [2] اب ڈاردانیل لکھا جاتا ہے۔ (نگار)

اور مخلوط حلقہائے انتخاب کی جگہ مسلم لیگ کے ذریعہ سے مانٹیگو چیمسفرڈ اصلاحات کے صرف جُداگانہ حلقہائے انتخاب قائم کرا دیئے اور مخلوط انتخاب کو جن کا مجھے شدید ترین مخالف اور اپنے تئیں پکا حامی بتایا جا رہا ہے، حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا اور بنگال، پنجاب کی مسلم اکثریتوں کو اقلیتوں میں تبدیل کرا کے اس خدا داد نعمت کو ٹھکرا دیا جو فاتحین اور مبلّغین اسلام کا طفیل تھی، اور ان کی جگہ اور صوبوں کی اقلیتوں میں چند مقابلۃً بیکار نشستوں کا اضافہ کرا دیا۔ یہ تھی وہ روداد چمن جو پہلی بار کی گرفتاری میں مجھ سے قفس میں لکھی گئی تھی۔

میرے قید و بند کے زمانہ میں ملک و ملت کو جن مصائب کا شکار بننا پڑا تھا، انھیں کے صدقے میں قوم و وطن میں ایک بیداری بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اس بیداری سے جہاں تک فائدہ اُٹھایا جا سکتا تھا، اُٹھایا گیا، اور ایک طرف ترکوں کو اسس غلامی سے نکلنے سے پوری مدد دی گئی، جس میں ان کی مدد سے محروم رہ کر ہم خود ساٹھ ستر بیشتر مبتلا ہو چکے تھے، اور دوسری طرف اپنے تئیں بھی اسس غلامی سے نکالنے کا سامان فراہم کیا گیا۔ مگر ؎

پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیانہ کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ہمارے قید ہوتے ہی ہندو مہاسبھائی مہاراشٹر نے مہاتما گاندھی جی اور عدم تعاون کے خلاف علمِ بغاوت کو بلند کیا۔ خود مہاتما گاندھی نے حکومت کو الٹی میٹم دے چکنے کے بعد باردولی میں وہ رَوِش اختیار کی جسے ملک نے ہتھیار ڈال دینے کے مترادف سمجھا، اور وہ خود بھی ہماری طرح قید کر دیئے گئے۔ ان کے قید ہونے کے بعد پنڈت موتی لال نہرو اور دیش بندھو داس آنجہانی آزاد ہوئے اور بجائے سول نافرمانی شروع کرنے کے، جس کا یادش بخیر، اب پھر کلکتہ میں نام لیا گیا ہے، گیا میں سوراج کے نام سے وہ علم بغاوت بلند کیا گیا، جس نے عدم تعاون کی تحریک کا خاتمہ کر دیا۔ پھر لُطف یہ کہ ہندو مہاسبھائیوں نے شُدھی

اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع کیں، جنہوں نے ان مذہبی تعصّبات کی آگ کو بڑھکایا جنہیں ہم ٹھنڈا کر چکے تھے۔ اور ان کے جواب میں مسلمانانِ پنجاب میں سے اسی عنصر نے تبلیغ و تنظیم کے نام سے زبانی جمع خرچ دکھانا شروع کیا، جو آج وطن پرستی اور ملت شکنی کا ڈھول بجا رہا ہے۔ اس طرح ہمارا کیا کرایا سارا کام اکارت گیا، اور جب مجھے جیل خانہ ہی میں اس کا احساس ہوا تو میں نے اس کا اس طرح اظہار کیا ؎

یہ حالت ہو گئی ہے، ایک ساقی کے نہ ہونے سے
کہ خم کے خم بھرے ہیں، مے سے اور میخانہ خالی ہے

یہ رودادِ چمن تھی جو دوسری گرفتاری سے رہائی پر میں نے آکر دیکھی اور جس کے متعلق میں نے جیل خانہ ہی میں لکھ دیا تھا کہ ؎

ہوا تھا قیدِ فصلِ گُل میں جو مرغ اسس کو گلشن میں
قفس سے چھٹتے ہی صیدِ غم، جورِ خزاں پایا

جس قفسِ گُل کا اس شعر میں ذکر کیا گیا ہے، اس کے پیدا کرنے میں ہمارا جو حصّہ تھا، وہ آج بھی کسی سے مخفی نہیں، مگر جس "جورِ خزاں" کا اس میں ذکر کیا گیا ہے، اس میں مُطلق ہمارا حصّہ نہ تھا۔ نہ ہم نے ڈاکٹر مونجے، مسٹر آنے اور مسٹر کیلکر کی طرح مہاتما گاندھی کے خلاف مہاراشٹر کی اس بغاوت میں حصّہ لیا تھا جو بالآخر پنڈت موتی لال نہرو کے خلاف بھی بغاوت کی شکل میں "جوابی تعاون" کے لاجواب نام سے ظاہر ہوئی۔ نہ ہم نے بارودلی کی کایا پلٹ میں حصّہ لیا تھا جو مہاتما جی سے وائسرائے کو الٹی میٹم کے بعد" بابا آں شور اشوری، یا بایں بے نمکی" کا مصداق ہوئی۔ اور جس نے عدم تعاون کی تحریک کو یک بیک ٹھنڈا کر دیا۔ نہ ہم نے گیا میں اس تحریک کے خلاف پنڈت موتی لال نہرو اور ان کے سوراجی ساتھیوں کی طرح علمِ بغاوت بلند کر کے حصّہ لیا، نہ پنڈت مدن موہن مالوی اور سوامی شردھانند آنجہانی کی طرح ہندو مہاسبھا کی قائم کردہ سنگھٹن اور شُدھی کی تحریکوں میں حصّہ لیا اور نہ ڈاکٹر کچلو اور اُن کے پنجابی رفقائے کار کی طرح "تبلیغ و تنظیم" کے نام سے اپنا

ڈھنڈورا پیٹا۔ آج یہی حضرات کلکتہ کی تماشا گاہ میں وطن پرستی کا سوانگ بھر رہے ہیں' یا وہ چند کانگریسی مسلمان ہیں جو یا تو اس زمانہ میں آزاد رہے' یا کم سے کم ہم سے کہیں جلد آزاد ہو گئے مگر جو نہ سوراجیوں اور تارکینِ تعاون کی تفریق کو روک سکے' نہ ہندو مسلم تفریق کو۔ تفرقہ پردازی' فرقہ وارانہ بُعد و بَعد اور مذہبی اور ملّی تعصبات کا الزام آج ہم پر تھوپا جاتا ہے۔ لیکن یہ بہتان لگانے والے اپنے گریبان میں مُنہ ڈال کر نہیں دیکھتے کہ ہمارے لگائے ہوئے چمنِ اتحاد کو ہمارے قید و بند کے زمانے[1] میں آخر کس نے ویران کر دیا تھا۔ میں نے قید سے چھوٹتے ہی اس تفرقہ پردازی تک کا خاتمہ کرانا چاہا' جس کی علت العلل موتی لال نہرو اور ہمارے رفقائے کار میں سے بہت سے مسلمان تھے۔ جنہوں نے گیا میں فیئۃ باغیۃ کی شکل اختیار کی تھی۔ اور جن کا جھگڑا چکانے کے لئے دہلی کا اسپیشل سیشن منعقد کیا جا رہا تھا۔ پنڈت موتی لال نہرو اور اُن کے سوراجیوں کو کونسلوں اور اسمبلی کی شرکت نے جو کچھ سوراج دلوا دیا' وہ ہمارے سامنے ہے۔ اس شرکت پر پنڈت جی کو' جو آج کانگرس کے صدر ہیں' اتنا اصرار تھا کہ انہوں نے خود مجھ سے فرمایا تھا کہ اگر کانگرس نے اس شرکت کی اجازت نہ دی تو میں کانگرس کے گرداگرد دو سو میل کے احاطہ میں بھی کبھی قدم نہ رکھوں گا۔ ایسے باغی کو جمہوریت کی طرف سے جو سزا ملنی چاہیئے' وہ پنڈت جی خود ہی تجویز فرما سکتے ہیں۔ کیونکہ "پارٹی ڈسپلن" کے نام سے ان کی جباری اور قہاری مشہور ہے (گو ہندو مہاسبھائیوں سے وہ ہمیشہ بچکتے رہے) میں نے اس خیال سے اپنی پارٹی سے طوعاً و کرہاً اس شرکت کی آج کے خداوند کانگرس وکنونیشن کو اجازت دلوائی کہ کہیں بردہ جیل سے نکل کر مہاتما گاندھی مجھ سے شکایت نہ کریں کہ تم نے کانگرس سے اتنی بڑی اقلیت کو کیوں

---

[1] عموماً امالہ کے اصول پر مولانا کاربند نظر نہیں آتے' لیکن یہاں امالہ کی ایک مثال سامنے آئی ہے' ۱۹۲۰ء تک بول چال میں امالہ کا رواج تھا' تحریر میں اس اصول پر کوئی کاربند نظر نہیں آتا ہے۔ اخبارات و رسائل کے علاوہ اُس عہد کی کتابیں بھی اس کی شہادت دیتی ہیں۔ (نگار)

نکال دیا اور کانگریس کے دو ٹکڑے کیوں ہونے دیئے۔ ورنہ میرا قیاس ہے
کہ دہلی میں بھی "اور مجھے کیا" ہر شخص کو یقینِ کامل ہے کہ کوکناڈا میں موتی لال جی
کو شکستِ فاش نصیب ہوتی اور کونسلوں میں جاکر گدّے دار کرسیوں پر براجنے
والے اور ملک کا اور اپنا روپیہ اور وقت ضائع کرنے والے کانگریس کے فرش
پر ۱۹۲۳ء کے بعد ہرگز نظر نہ آتے۔ جب مہاتما گاندھی برودہ جیل سے چھوٹے
اور جوہو میں آرام کرنے لگے تو ہماری پارٹی والوں نے مہاتما جی کو سوراجیوں
کے خلاف اتنا اُبھارا کہ احمد آباد کی کانگریس کمیٹی کے جلسے میں مہاتما جی نے
اُنھیں کانگریس کمیٹی تک سے نکالنے کی کوشش کی، گو میں تو لڑ جھگڑ کر ان کو
اپنی مجلسِ عاملہ تک میں داخل کر چکا تھا۔ ہماری ہی کوشش سے مہاتما جی اس
کارروائی سے باز آئے، مگر اس کے صلہ میں ہماری پارٹی نے میرے مُنہ پر مہاتما جی
سے میری اس طرح شکایت کی کہ اس کا سُننا گالیاں کھانے سے بھی مجھے کم گوارا
ہونا چاہیئے تھا اور یقیناً مہاتما جی خود بھی ان شکایت کرنے والوں کا دل بڑھا رہے
تھے۔ باوجود اس کے جب مہاتما جی کے برت کے بعد حکومت بنگال نے حکومتِ ہند
اور وزیرِ ہند کی اِجازت سے سوبھاش چندر بوس اور ان کے سوراجی رفقائے کار
کو بلا مقدمہ چلائے قید و بند میں مبتلا کر کے جلا وطن کر دیا تو میں نے ہی مہاتما جی کو
آباد کیا کہ وہ باوجود اپنی کمزوری کے کلکتہ تشریف لے جائیں۔ اور حکومت اور
سوراجیوں اور دُنیا پر صاف ظاہر کر دیں کہ ہماری پارٹی اس معاملہ میں سوراجیوں
کے ساتھ ہے۔ مہاتما جی نے اصولِ جمہوریت کو نظر انداز کر کے تن تنہا یہ فیصلہ کر ڈالا
اور سوراجیوں کو سُنا دیا کہ کانگریس کو اب اُن کے سپرد کر دیا جائے گا، اور
طوعاً و کرہاً ہم نے اسے بمبئی کے جلسے میں قبول بھی کیا، اور میں نے اسی دیرینہ اُمید
پر اس کی تائید "کمریڈ" میں بھی کی کہ ایک نہ ایک دن سوراجی کونسلوں میں شرکت
کی حماقت سے تنگ آکر ملک میں کام کرنے کے لئے ہم سے آملیں گے اور عدم
تعاون کی تحریک پھر زور پکڑے گی اور تفریق کی خلیج ہمارے اور ان کے درمیان

گیا سے لے کر اس وقت تک حائل چلی آتی ہے، وہ حائل نہ رہے گی۔ مگر مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ مہاتماجی تارکینِ تعاون، سوراجی، جوابی تعاون والے اور وہ لبرل جنہوں نے حکومت کے ساتھ تعاون کر کے تارکینِ تعاون کو مہاتماجی سمیت جیل بھجوایا تھا۔ سب "ڈومینین اسٹیٹس" اور مہاسبھائیت پر راضی ہو جائیں گے۔ اور وطن دوست حامیانِ اتحاد کہلائیں گے، اور سارے ہندوستان میں اگر کوئی تفرقہ پرداز، اتحاد کا دشمن اور وطن کے خلاف غدار رہے گا تو اس کا نام یا شوکت علی ہو گا یا محمد علی!

مہاتماجی جب یرودہ جیل سے چھوٹے تھے تو انہوں نے اخبارات کے ذریعہ سے ایک پیغام میرے نام ارسال فرمایا تھا، جس میں ارشاد کیا تھا کہ جو تفریق ہندو مسلمانوں میں پڑ گئی ہے، اس کے مٹانے ہی سے تم اپنی صدارتِ کانگریس میں کامیاب سمجھے جا سکتے ہو۔ میں نے اس تفریق کے مٹانے میں جس قدر کوشش کی، اس کے متعلق میں فیصلہ خدا ہی پر چھوڑ سکتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ خدائے عالم الغیب والشہادۃ اس کام میں میری جد و جہد کو کسی ہندو اور کسی مسلمان سے کم نہ ٹھہرائے گا۔ افسوس ہے کہ چند مقامات پر ہندو مسلمانوں کے درمیان تنازعات سے متاثر ہو کر مہاتماجی نے کوہاٹ کے نزاع کی خبر سنتے ہی بلا ہم میں سے کسی سے بھی مشورہ کئے ہوئے ۲۱ دن کا برت میرے ہی غریب خانہ پر قیام کے زمانے میں رکھ لیا[۱] اور برت رکھنے اور برت کھولنے پر تقریر فرمائی اور ہم سے خاص طور

---

[۱] ہماری نظر میں مسٹر گاندھی نے یہ برت کسی روحانی روشنی کے بجائے اُس سیاسی روشنی کی وجہ سے رکھا تھا، جو جیل سے رہا ہونے کے بعد اُن کی غیر مقبولیت اور علی برادران کی بے پناہ مقبولیت کے بطن سے پیدا ہوئی تھی۔ ہندو سماج نے مسٹر گاندھی کو قطعاً نظر انداز کرتے ہوئے ہندو مہاسبھا اور سنگٹھن کا ساتھ دیا تھا۔ اور انھیں "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک تو خوش آئند معلوم ہوتی تھی لیکن "عدم تعاون" یا "ترکِ موالات" کی تحریک براہِ راست اُن کی معاشی بنیاد کو ہلا دینے کے مترادف تھے۔ لہٰذا

(بقیہ آگے صفحہ پر)

پر خطاب کرتے ہوئے دونوں سے ظاہر کردیا کہ وہ مسلمانوں کو ظالم اور ہندو کو مظلوم سمجھتے ہیں۔ کوہاٹ کے متعلق جو بیان انہوں نے شائع فرمایا، شوکت صاحب کے بیان سے بہت کچھ مختلف تھا۔ اس کے بعد سے تو انہوں نے ہندو مسلم تنازعات اور منافشات کو چکانے کا کام ہی بند کردیا۔ اور جب کبھی ان سے ہم دونوں بھائیوں، ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر محمود، یا اور کسی نے اس بارے میں عرض کیا تو انہوں نے اس میں حصہ لینے سے انکار ہی فرمایا۔ اور اس کام کو کلیتہً خدا ہی پر چھوڑ دیا۔ اگر میری صدارت کانگریس کی طرح ان کی صدارت کی کامیابی کا معیار اس تفرقہ کا مٹانا تسلیم کیا جائے، تو مجھے خوف ہے کہ وہ مجھ سے بھی کم کامیاب سمجھے جائیں گے۔ اور یہی حال کانگریس کے تمام صدروں کی صدارت کا ہوگا۔ اور جو کچھ کامیابی کسی کو نصیب ہوئی، وہ اس کارروائی کا نتیجہ تھی جو سری نواس آینگر نے ہمارے ایما سے بالآخر ہمت کر کے ۱۹۲۷ء میں کلکتہ کی کانگریس کمیٹی میں شروع کی تھی اور جسے انہوں نے اور ہم نے مدراس کی کانگریس اور کلکتہ کی مسلم لیگ میں انجام کو پہنچایا تھا۔

مہاتما جی کی اس مسئلہ میں خاموشی ایک ایسا عقیدہ ہے جس کا واکرنا بہت مشکل ہے۔ انہوں نے جو ہو سے اس بارے میں ایک مبسوط بیان شائع کیا

پچھلے صفحہ کا بقیہ: مہاراشٹر میں گاندھی جی تنہا رہ گئے اور ہندو ساہوکاروں اور سرمایہ داروں نے انہیں پورے ہندوستان میں اپنا لیڈر ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ انگریز راج بھی "ہندو مسلم اتحاد" سے لرزہ براندام تھا، جس کا منظر اس نے خلافت تحریک کے زمانہ میں دیکھا تھا مسٹر گاندھی نے کوہاٹ کے اس ہندو مسلم فساد جو انگریزوں کی شہ پر ہوا تھا کا بہانہ بنا کر محمد علی کے مکان پر ۲۱ دن کا برت رکھا اور پھر کھلم کھلا مسلمانوں کو ظالم اور ہندوؤں کو مظلوم قرار دے دیا۔ یہ برت خود علی برادران کے سیاسی قتل کا منظر نامہ بن گیا۔ (نگار)

تھا، جس میں ارشاد فرمایا تھا کہ مسلمان ظالم (BULLY) اور ہندو بزدل (COWARD) ہیں۔ اسی دن سے ہندو مہاسبھائیوں نے ٹھان لی کہ اب ظالم بنیں گے اور مسلمانوں کو بزدل بنا کر چھوڑیں گے، اور جب کلکتہ اور داناپور اور بتیا میں ہنود کے مظالم پر اس مہاتما نے کچھ نہ کہا جو ہمیشہ چھوٹے چھوٹے تنازع کے بعد بھی مسلمانوں کو پند و موعظت سے مستفیض کرتا رہا تھا، اور جو اس کا دعویدار ہے کہ ہندو دھرم ہی میں "اہمسا" کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے، تو میں اقرار کرتا ہوں کہ میرے دل میں بھی شبہ پیدا ہونے لگا کہ مہاتما جی سمجھتے ہیں کہ اسی طرح مسلمان ظلم سے اور ہندو بزدلی سے اجتناب کریں گے۔ کہ مسلمانوں پر کلکتہ، داناپور اور بتیا کی طرح ہنود مظالم توڑیں اور باوجود "اہمسا" کو "پرمو دھرم" سمجھنے کے مسلمانوں کو "اہمسا" کا شکار بنائیں۔

ہم نے جس صبر سے کام لیا، اس کا اندازہ کچھ انہیں الزامات سے ہو سکتا ہے جو ہم پر ہماری ملّت نے ہماری قید کے زمانہ سے لے کر آج تک مسلسل لگائے ہیں۔ اور جن میں سب سے زیادہ حصّہ خود جمعیت خلافت کے اس باغی عنصر نے لیا ہے جو آج وطن پرستی اور اتحادِ ملکی کا دعویدار ہے اور کانگریس اور کنونیشن کی صفوں میں ڈاکٹر منجے اور پنڈت مدن موہن مالوی کے ساتھ دوش بدوش کھڑا ہے۔ ہماری "ہندو پرستی" ہی نے ڈاکٹر کچلو کو صدارتِ خلافت سے مستعفی کرا کے سر محمد شفیع وغیرہ کی جماعت سے جا ملایا اور ہماری "ہندو پرستی" ہی نے "زمیندار" کے سینکڑوں صفحات کو اس کے نامۂ اعمال کی طرح سیاہ کرا دیا۔ لیکن آخر صبر کی بھی اِنتہا ہوتی ہے، اور جب ہمارا جامِ صبر لبریز ہو گیا تو ہم نے کلکتہ کے فسادات کے بعد مہاتما گاندھی، مسز نائیڈو (صدر کانگریس) اور پنڈت موتی لال نہرو کو دہلی میں مدعو کیا کہ ہنود کو مہاسبھائیت

سے بچائیں ۔ ورنہ مسلمان جو پہلے بھی ایک حد تک ہمارے قابو سے باہر نکل چکے تھے، بالکل ہمارے قابو سے باہر ہو جائیں گے اور حقیقتاً ہمارا بھی یہ فرض ہو جائے گا کہ ان کی جماعت کو منظم کر کے مدافعت کریں ۔ مہاتما جی گوشۂ تنہائی میں پورا ایک سال گذارنے کا عہد کر چکے تھے[1] الا ماشاء اللہ اور سوائے گورنر بمبئی وغیرہ سے زراعت کے متعلق گفتگو کرنے کے لئے ان کے پاس جانے کے وہ کانپور کی کانگریس کے بعد سے گوہاٹی کانگریس تک کہیں تشریف نہ لے گئے ۔ مسز نائیڈو وبیچاری پر کانپور ہی میں بجائے گلدستوں کے اُگالدانوں کا مینہ برسایا جانے والا تھا، مگر وہ اس پر بھی آمادہ و تیار تھیں کہ اس کام میں پورا حصہ لیں ۔ اور جو کچھ اپنی صدارتِ کانگریس سے پہلے انہوں نے پنجاب میں کہا تھا اُسے دُہرائیں ۔ لیکن پنڈت موتی لال نہرو نے جو اپنے سوا صرف ایک دیوتا یا دیوی کی پرستش کرتے ہیں، اور اس کا نام اکثریت ہے، اور جو لالہ لجپت رائے آنجہانی کو سوراج پارٹی کے رشتہ میں مربوط رکھے رہنے کی موہوم امید ہیں، صوبۂ سرحد کو اصلاحات دیئے[2] جانے کی ممانعت کر چکے تھے ۔ اِلّا یہ کہ وہ پنجاب میں

---

[1] گاندھی جی کا یہ طرزِ عمل بھی اپنی کھوئی ہوئی شہرت کی بحالی کے لئے تھا اور وہ ہندو سیٹھ ساہوکاروں، سرمایہ داروں، اور صنعت کاروں سے ٹکرانے کے بجائے اُنھیں اپنے ساتھ ملائے رکھنا چاہتے تھے ۔ لہٰذا اُنہوں نے "ہندو مہاسبھا" اور "سنگھٹن" کی کھلی فرقہ پردازی کے خلاف سد بننے کے بجائے اُنہوں نے نشوو ارتقاء پانے اور قدم جمانے کا موقعہ دیا، سوراج پارٹی کے قائد موتی لال نہرو اور اُن کے ہم خیال بھی یہی کام دوسرے دائروں میں کر رہے تھے ۔ مولانا محمد علی اور مسز نائیڈو وہ "ہندو مسلم اتحاد" کی ناکام کوشش کرتی رہیں ۔ مسٹر گاندھی کی یہ خاموشی، وقتی فرار برطانوی سامراج کے لئے بھی مفید ثابت ہوئی (نگار)

[2] یقیناً کتابت کی غلطی کی وجہ سے اس مقام پر "لئے" لکھا گیا ہے ۔ (نگار)

مدغم ہوکر اپنے ۹۲ فی صدی کی مسلم اکثریت کو تقریباً ضائع کرا دے' صاف انکار کر دیا
اور فرمایا کہ انتخابات کے زمانہ میں ان سے ہرگز اس کی توقع نہ رکھنی چاہئے کہ
وہ ہندو مہاسبھا اور اس کی ناز یبا حرکات کی علانیہ مذمت کریں گے۔ اس پر
تب پنجاب اور بہار کے مسلمانوں نے ہم پر پورا دباؤ ڈالا کہ اب جمعیتِ خلافت
کو بھی اجازت دی جائے کہ وہ ہنود کے مقابلہ کے لئے مسلمان حلقہ ہائے
انتخاب سے اپنے اُمیدواروں کو منتخب کر دے' مگر ہم نے اس پر بھی جمعیتِ
خلافت کو اس سے باز رکھا۔ پنڈت موتی لال نہرو جو اسکین کمیٹی کی رکنیت
کو اپنے لئے نہایت ہی ضروری سمجھتے تھے' اکثریت کی دیوی کا رنگ دیکھتے
ہی اس کمیٹی پر لات مار بیٹھے اور کونسلوں اور اسمبلی سے سوراج پارٹی
کو نکال لائے' مگر نہ اس لئے کہ جیسا کہ اب وہ فرار کرنے لگے تھے۔ وہ کونسلوں
میں اس تعداد میں اپنی جماعت کی شرکت کو بے سود پا چکے تھے۔ بلکہ صرف
اس اُمید پر کہ اس بے نظیر جرأت کا ووٹ دینے والوں پر اچھا اثر پڑیگا۔
اور کونسلوں اور اسمبلی میں ان کی پارٹی کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو جائے گا۔
مگر اس تعداد میں خاک اضافہ نہ ہوا۔ اور اگر اُن سری نواس آئنگر کو جو
پنڈت جی کے خاص محبوبوں میں نہیں ہیں' مدراس میں اس قدر کامیابی نہ
ہوئی ہوتی تو سوراج پارٹی نئے انتخابات میں سے اور بھی زیادہ ہزیمت خوردہ
ہو کر نکلتی۔ پھر بھی پنڈت جی جو "واک آؤٹ" کر چکے تھے "واک اِن" فرمانے
لگے۔ مگر باوجود صوبۂ سرحد کے ساتھ سراسر بے انصافی کرنے کے لالہ جی آنجہانی
ان کی پارٹی سے صاف نکل جا چکے تھے' اور مالوی جی' لالہ جی اور مہاراشٹر
کے ہندو مہاسبھائیوں نے انھیں ہر جگہ شکست دی تھی۔ اور خود اپنے صوبہ
میں تو ہنود میں سے صرف ایک وہ اور ان کے دوست "رنگا آیر" کامیاب
ہوئے تھے۔ حالانکہ مسلمانوں نے اپنے جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب سے تین سو
راجیوں کو منتخب کر کے بھیجا تھا۔ جب پنڈت موتی لال نہرو نے مہاسبھائیوں

کو ایک حرف بھی کہنے سے انکار کیا تو حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم نے مجبور ہو کر ان سے صاف کہدیا کہ اب وہ مسلمانوں سے کچھ توقع نہ رکھیں۔ اس پر پنڈت جی نے الہ آباد جاتے ہوئے کانپور سے ایک تار ہمارے نام بھیجا' جس میں ہم سے درخواست کی گئی کہ ہم سے علیحدگی اختیار نہ کریں اور دوبارہ اس امر پر غور و خوض کریں اور جو کچھ مسلمانوں کے مطالبات ہوں ان کو پیش کریں۔ اس کا جواب ان کو یہ دیا گیا کہ ہم کو جو کچھ کہنا اور کرنا تھا' وہ ہم کہہ چکے اور کر چکے' اب اگر مسلمانوں کے ساتھ انصاف کرنا مقصود ہے اور ان کو ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں اپنے دوش بدوش رکھنا منظور ہے تو غیر متعصب ہندو لیڈر انھیں اور متعصب ہنود کو سمجھا دیں کہ یہ لچھن ہندوستان کو آزاد کرانے کے نہیں ہیں۔ اس تار پر نہ صرف کانپور کی کانگریس کے صدر مولانا شوکت علی کے دستخط تھے۔ جن پر تعلیم یافتہ ہندو نوجوانوں نے بمبئی جیسی فضا میں "شرم شرم" کے آوازے کسے تھے۔ اور جن کے منہ پر ان میں سے ایک نے تھوک بھی دیا۔ نہ اس تار پر صرف محمد علی کلکتہ کی خلافت کانفرنس کے صدر کے دستخط تھے۔ جس کی کنونیشن والی تقریر کے ہر فقرے پر شور برپا کیا گیا تھا۔ حالانکہ وہ ہندو مسلم مناقشات یا مطالبات کے متعلق مطلق نہ تھی' بلکہ صرف آزادی اور غلامی کے مسئلہ پر کی گئی تھی۔ اور ہنود کی غلامی تک کو انگریزوں کی غلامی پر اس میں ترجیح دی گئی تھی۔ اس پر حکیم اجمل خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بھی دستخط تھے جو ہم دونوں سے کہیں زیادہ ہندو مہا سبھا کی زیادتیوں اور مہاتما جی اور پنڈت موتی لال نہرو کی خاموشی کے شاکی تھے' اور جو ان دل خراش وقعات سے ایک سال پیشتر ہی دنیا سے کوچ کر گئے اور اس تذلیل سے بچ گئے۔ یہی نہیں بلکہ اس تار پر ان مولانا ابو الکلام صاحب آزاد کے بھی دستخط تھے جو ہنود کی زیادتیوں کے بارے میں عرصہ سے دہنِ مبارک پر مُہرِ سکوت لگا کر ابو الکلام کی جگہ "ابو السکوت" بنے بیٹھے ہیں۔ اور جیہوں نے واللہ اعلم بالصواب بقول راویانِ ثقہ

کنونیشن کے تماشا کے ختم ہونے پر فرمایا کہ مسلمان احمق تھے کہ وہ کنونیشن کے سامنے اپنے مطالبات پیش کرنے آئے، اور ہندو احمق تر تھے کہ انہوں ایسے مطالبات تک کو قبول نہ کیا، جس کے یقیناً یہ معنی ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد عقل مند ترین شخص ہیں کہ بالکل خاموش رہے۔ اور امام الہند بولے بھی تو ایک مشہور لطیفہ کے امام کی طرح جس کے سارے مقتدی نماز میں بول اُٹھے تھے اور جس نے بالآخر کہا کہ "شکرِ خدا کہ من نہ بولیدم"!

جب ہماری سعی لاحاصل رہی اور ایک ہندو لیڈر بھی ہندو مہاسبھا کی بیہودگیوں کے خلاف کچھ نہ بولا تو ہم نے ۸ ر اور ۹ ر اپریل ۱۹۲۶ء کو حجِ بیت اللہ اور مؤتمر عالمِ اسلام میں شرکت کے لئے احرامِ سفر باندھتے وقت بھی دہلی میں خلافت اسپیشل کانفرنس کا اجلاس کیا جس میں بالکل آخر وقت مولانا ابوالکلام آزاد صدرِ خلافت نے خطبۂ صدارت دینے سے اس بنا پر انکار فرما دیا کہ آپ مباحثہ میں حصہ لینا چاہتے ہیں، حالانکہ اس میں ذرا بھی حقیقت نہ تھی [1] اور آپ اس وقت بھی ابوالسکوت ہی بنے بیٹھے رہے۔ اور اگر زبان سے کچھ کلمات آپ نے نکالے بھی تو یہی نازیبا کلمات جن میں آپ نے کنور عبدالوہاب خاں صاحب کو، جو استفسار کر رہے تھے کہ آپ کب وہ تقریر فرمائیں گے، جس کا وعدہ فرما چکے ہیں، اور

---

[1] اگر حقیقت بھی ہوتی تو کیا مولانا ابوالکلام آزاد واقعی ابوالسکوت ثابت ہوتے! امر واقعہ یہ ہے کہ "خلافت تحریک" ایک عارضی تحریک تھی، ترکی کے خلافت کو ترک کرنے کے بعد اس کے قائم رکھنے کا جواز قطعاً نہ تھا۔ خلافتِ ترکیہ کو جو سامراجی قوتوں زارِ روس، جرمنی اور برطانیہ کی باہمی آویزش وریشہ دوانی سے ضرر پہنچا، اُسے روکنے کی یہ تحریک فطری موت اُسی دن مرگئی جب مصطفیٰ کمال نے ترکی میں خلافت اور خلیفہ کو ختم کر دیا تھا۔ اب ہندوستان میں نئی بساطِ سیاست بچھانے کی ضرورت تھی۔ (نگار)

اور اصرار کر رہے تھے کہ ضرور تقریر فرمائیے۔ نہایت بے دردی سے ڈانٹا۔
اس کانفرنس کی مجلسِ استقبالیہ کی صدارت حکیم اجمل خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ
نے فرمائی اور کانفرنس کی صدارت بلا توقف مولانا ابوالکلام صاحب کی جگہ
مولانا سید سلیمان ندوی نے فرمائی۔ ڈاکٹر انصاری صاحب اس وقت نواب
بھوپال کی معیت میں انگلستان تشریف رکھتے تھے۔ جب آپ واپس تشریف
لائے تو آپ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، آتے ہی جمعیتِ خلافت سے مستعفی ہو گئے۔
یہ وہ زمانہ تھا کہ صدرِ خلافت مولانا ابوالکلام آزاد نے پنڈت موتی لال نہرو کی
معیت میں ایک بیان شائع فرمایا تھا، جس میں ایک نئی انجمن کی تو نہیں البتہ
اس کے جنین کی تخلیق فرمائی گئی تھی، جس کی رکنیت کی شرط یہ تھی کہ اس کا
کوئی رکن کسی مذہبی یا ملی انجمن کا کارکن ہرگز نہ ہو، اور جس کی میں نے حج سے
واپس آکر "ہمدرد" ہی میں اس طرح تائید کی تھی کہ اس انجمن کے دروازہ پر
اسی طرح یہ لکھا ہوا ہے کہ "اس میں جو داخل ہو دین و مذہب کو پہلے باہر
چھوڑ آئے" جس طرح ڈانٹے اور ملٹن کے تخیل نے دوزخ کے دروازے
پر اس عبارت کو آویزاں کرا دیا تھا کہ "اس میں جو داخل ہو اُمید کو پہلے
باہر چھوڑ آئے"۔ جمعیتِ خلافت کا بھی عام طور پر ان انجمنوں کے ساتھ
نام لیا جا رہا تھا، جن کی رکنیت اس جنین کی رکنیت کے لئے مانع قرار دی
گئی تھی۔ صدرِ خلافت جو اس لادینیت کے دو بانیوں میں سے ایک تھے۔
انہوں نے تو ابھی صدارت سے اپنا استعفا نہیں بھیجا تھا۔ مگر ڈاکٹر انصاری
صاحب نے ہمارے حج و زیارت اور مؤتمر سے آنے سے پہلے ہی اپنا استعفاء
ارسال فرما دیا تھا۔ گو وہ منظور نہیں کیا گیا، ورنہ جس طرح وہ کانپور کانگریس
کے بعد مسلم لیگ کو بے حد ذلیل سمجھ کر ہمارے ساتھ اس کے جلسہ منعقدہ علی گڑھ
میں شریک نہ ہوئے تھے، بلکہ ہم کو بھی ایسی ذلیل اور بے حقیقت جمعیت میں
شریک ہونے سے روکتے تھے، اس طرح وہ امسال کلکتہ میں مرکزی خلافت کمیٹی

کے جلسہ میں بھی شریک نہ ہوئے ہوتے اور غنڈوں اور اوباشوں اور بدمعاشوں کی زد میں نہ آتے۔ نہ اس کنونیشن میں جس کے وہ صدر تھے، مرکزی خلافت کمیٹی کے نمایندوں کو نہرو کمیٹی کی سفارشات منظور کرانے، اس بے حد وقیع جماعت کے ساتھ جاتے جس کے اسمائے گرامی انہوں نے اخبارات میں بڑی دھوم دھام سے شائع کرائے ہیں۔

(۲)

۱۳ر جنوری ۱۹۲۹ء

دہلی کی اسپشل کانفرنس پر جو کچھ محنت اور جس قدر روپیہ اہلِ دہلی نے صَرف کیا تھا، تقریباً سب کا سب رائیگاں گیا۔ اس لئے کہ ہمارے حجاز چلے جانے کے بعد جنابِ صدر مولانا ابوالکلام آزاد اور مرکزی کمیٹی نے کچھ کام نہیں کیا۔ البتہ میں نے مُصمّم ارادہ کر لیا تھا کہ گوہاٹی کی کانگریس میں مَیں مسلمانوں کی فریاد پیش کروں گا، لیکن مشیّتِ ایزدی یہ نہ تھی، ریل ہی میں ہمیں اطلاع ملی کہ سوامی شردھانند کو ایک مسلمان نے قتل کر ڈالا، اور ایک مسلمان کے اس فعل کے باعث ساری مِلّت کو معذرت کرنا پڑی، اور مظلوم پر سے اس شبہ کو دور کرنے کی ضرورت آپڑی کہ وہ خود ہی ظالم ہے۔

اب ۱۹۲۷ء کا آغاز ہوا، اور رمضان المبارک میں ۲۰ر مارچ کے دن تیس پینتیس ۳۵ سربرآوردہ مسلمانوں نے ان تجاویز پر اتفاق کیا جو "تجاویز دہلی" کے نام سے جلد مشہورِ خلائق ہو گئیں۔ اور جنہوں نے بقول سری نواس آئنگر مہاسبھا کے بادباں میں سے ساری ہوا نکال ڈالی۔ کانگریس کی مجلسِ عاملہ نے ان تجاویز کا خیر مقدم کیا، مگر ہندو مہاسبھا نے اسی وقت سے ان کی اس طرح مخالفت شروع کی کہ مخلوط اِنتخاب کی اس تجویز کو جو مُتعدد شرائط

سے مشروط تھی بطیبِ خاطر قبول فرمانے کا اظہار فرمایا، مگر سب شرائط کی مخالفت کی، اور اُس چیز کا جس سے محتاط مسلمان پہلے ہی لرزاں تھے، بڑے زور شور سے پروپگنڈا شروع کر دیا یعنی شرائط کو قطعاً نظر انداز کر کے مشہور کرنا شروع کر دیا کہ اب تو مسلمان ہی جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب سے دست بردار ہو گئے۔ محتاط مسلمانوں نے ہر جگہ مجھ سے التجا کی تھی کہ خدارا ایک لفظ بھی جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے خلاف نہ لکھئے، نہ اس کا اظہار کیجئے کہ کسی حالت میں اور کتنی ہی شرائط کے ساتھ سہی، ہم جُداگانہ حلقہ ہائے اِنتخاب ترک کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ کیونکہ ہندو فوراً گورنمنٹ سے (جس نے مسلمانوں کے ساتھ ۱۹۱۱ء میں امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں بمقام کلکتہ عہد کر لیا تھا کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب اس وقت تک قائم رکھے جائیں گے، جب تک کہ مسلمان خود نہ کہہ دیں کہ یہ ہمیں درکار نہیں) کہنا شروع کر دیں گے کہ لو اب تو مسلمان خود ان سے بیزار ہیں اور شرطیں ساری کی ساری دھری رہ جائیں گی، گورنمنٹ ایک شرط کو بھی منظور نہ کرے گی۔ اور ہندو کہہ دیں گے کہ ہم کیا کریں، ہم نے تو منظور کر لی تھیں، گورنمنٹ قبول نہ کرے تو ہم کیا کریں۔ اور مانا کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب اقلیتوں کے لئے بے سود ہی نہیں، مُضر ہیں۔ ان کے حقوق کی حفاظت ان کے ذریعہ سے نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان کی حقیقی حمایت تو ہو سکتی ہے، اگر یہ غت ربود ہو گئے تو ہم دل کی بھڑاس نکالنے سے بھی رہے، نماز بخشوانے جائیں گے تو کہیں اُلٹے روزے اور گلے نہ پڑ جائیں۔ اس کے جواب میں ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا کہ اتنا بھی اندھیر کہیں ہو سکتا ہے۔ "دہلی کی تجاویز" درحقیقت ایک تجویز کا نام ہیں اور وہ یہ ہے کہ:

> اگر ہندو اقلیتیں پانچ صوبوں میں ہمارے انصاف پر اعتماد کرنے کو آمادہ ہیں تو ہماری اقلیتیں بھی نَو صوبوں میں اُن کے انصاف پر اعتماد کرنے کو آمادہ ہیں۔ ورنہ نہیں۔ لہٰ

جب تک پانچ صوبوں میں ہماری اکثریت مُتعیّن ہو، ہم جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب سے ہرگز دستبردار نہیں سمجھے جاسکتے۔ تاہم ہندو مہاسبھا نے اسی دن سے جب سے کہ وہ اِن تجاویز کے دھچکے سے کسی قدر سنبھلی، یہ کہنا شروع کیا کہ یہ بھی عجیب دھاندلی ہے کہ ساری کی ساری تجاویز ہم سے منوائی جاتی ہیں ہیں ان میں سے جو معقول معلوم ہوں گی، اُنھیں کو ہم قبول کریں گے، اور جو معقول معلوم نہ ہوں گی ان کو ہم مُسترد کردیں گے اور بظاہر تمام نام نہاد "تجاویز" میں سے صِرف یہ "تجویز" ہندو مہاسبھا کو معقول معلوم ہوئی کہ مسلمان جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب سے دستبردار ہوتے ہیں۔ حالانکہ جیسا میں اوپر کہہ چکا ہوں، اس تجویز کو کسی نے بھی پیش نہیں کیا تھا۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی عرض کردوں کہ جن سربرآوردہ مسلمانوں نے ان "تجاویز" پر اتفاق کیا تھا ان میں سے کسی نے پوچھا کہ اگر یہ منظور نہ ہوں تو کیا کیا جائے۔ اس وقت متعدد حضرات نے کہا کہ تب تو جُداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کو قائم رکھا جائے۔ مگر ڈاکٹر انصاری اور ان کے ساتھ دو تین مسلمان سوراجیوں نے جو اسمبلی اور کونسل اُوف اسٹیٹ کے ارکان تھے فرمایا کہ اس حالت میں بھی مخلوط حلقہ ہائے اِنتخاب قائم کرا دینا چاہیئے۔ میں نے اس وقت بھی اسی طرح اس سے اختلاف کیا تھا، جس طرح کہ ۱۹۲۶ء میں برابر اختلاف کرتا رہا تھا۔ حالانکہ سری نواس آئنگر کی اس تجویز پر سوائے لالہ لجپت رائے کے اور ممبرانِ مجلسِ عاملہ کانگریس متفق تھے کہ اگر مسلمان مخلوط حلقہ ہائے انتخاب قبول کرلیں تو اُنھیں تمام کونسلوں میں اور اسمبلی میں، جہاں ان کی اقلیت ہے، اُتنی ہی نشستیں دے دی جائینگی۔

سلہ گویا "پاکستان" کا تصور اندورنِ ہند (یا وفاقِ ہند کے اندر) بالکل واضح طور پر سامنے آیا جو اگلے دس برس میں اور علامہ اقبال نے بھی خطبۂ الٰہ آباد میں اسی تصور کی وکالت کی، لیکن ہندو مہاسبھا کانگریس گویا پاکستان بنانے پر تلے ہوئے تھے اور تا آنکہ قراردادِ پاکستان منظور کرلی گئی۔ (نگار)

جو انھیں اس وقت حاصل ہیں، اور پنجاب اور بنگال میں ان کی اکثریت قائم کردی جائے۔ ڈاکٹر انصاری اور چند سوراجی ارکان اسمبلی و کونسل آف اسٹیٹ کے اس طرح بلا شرط مخلوط انتخاب کو قبول کرنے پر میں نے اور غالباً نواب اسمٰعیل خاں نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ اتنی دیر بعد تو ایک چیز پہ اتفاق ہوا، ابھی سے اختلاف بھی شروع ہوگیا۔ آج ہی اس پر بحث کرنے سے کیا حاصل کہ گورنمنٹ ان شرائط کو قبول نہ کرے تو کیا کیا جائے، جب گورنمنٹ انکار کرے تو اس وقت پھر غور کرلیا جائے، اور اس وقت جو چیز مناسب ہو کی جائے۔ اس پر سب متفق ہو گئے۔ اور اس طرح ڈاکٹر انصاری اور سوراجی حضرات اور سر محمد شفیع اور جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے دلدادہ اور ہم لوگ جو نہ جداگانہ کے اس طرح دلدادہ تھے نہ مخلوط کے، ایک ہی فیصلہ پر راضی ہوکر مغرب کے قریب اس جلسہ سے رخصت ہوئے۔ افسوس کہ اپنی معبود اکثریت کی دیوی کی خاطر ہندو مہاسبھا سے مرعوب ہوکر پنڈت موتی لال نہرو نے دہلی کی تجاویز کو حکومت کے سامنے بھی پیش نہ ہونے دیا، اور ڈاکٹر انصاری اور ان کے سوراجی رفقائے کار اپنے اس عہد سے پھر گئے جو ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو رمضان شریف کے مبارک مہینہ میں انہوں نے ہمارے ساتھ کیا تھا کہ جب تک ہماری شرائط کو رد نہ کردے، ہم اس کا فیصلہ نہ کریں گے کہ اس حالت میں بھی جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کو ترک کردیا جائے یا قائم رکھا جائے۔

یہ تو کنونشن کے صدر صاحب کی کایا پلٹ تھی۔ اب نہرو کمیٹی کے اور کانگریس کے صدر صاحب اور درحقیقت کنونشن کے بھی اصلی صدر صاحب کی کایا پلٹ ملاحظہ ہو۔ ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کی دہلی کی تجاویز پر وسط مئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے غور کیا۔ مالوی جی صاحب تشریف نہ لائے، اور لالہ جی آنجہانی جنیوا اور ولایت کو چل دیئے۔ گو وہ ارشاد فرماتے تھے کہ میں اپنے رفقاء سے کہہ گیا تھا کہ ان تجاویز کو مسترد نہ کردینا، اور اسی وجہ سے وہ مسترد نہ کی گئیں۔ ڈاکٹر منجے، مسٹر جیکر اور

مسٹر کیلکر اور غالباً مسٹر انے بھی شریک تھے ۔ جب مجلس عاملہ میں یہ تجاویز پیش ہوئیں ۔ تو جس شخص نے ان کے منظور کرانے میں سب سے زیادہ حصّہ لیا وہ خود پنڈت موتی لال نہرو تھے ۔ صوبہ سرحد کو اصلاحات دیئے جانے کے اب وہ مخالف نہ تھے ۔ اس لئے کہ اب ان پر لالہ جی کی شہ نہیں پڑ رہی تھی، جس بازی میں لالہ جی کے مُہرے کی ان پر شہ پڑ رہی تھی، یعنی ۱۹۲۶ء کے انتخابات، اس بازی کو وہ ہار ہی چکے تھے، اور لالہ جی اسے جیت چکے تھے ۔ سندھ کی علیحدگی بھی انھیں منظور تھی لیکن اسے ایک معقول شکل میں پیش کرنے کے لئے انہوں نے یہ بڑھاوا دیا کہ زبان کی علیحدگی کی بنا پر کانگریس اسے علیحدہ صوبہ بنا چکی ہے، اور اسی بنا پر وہ راضی ہوگئے کہ اندھرا اور کرناٹک کی علیحدگی کا بھی اعلان کر دیا جائے، حالانکہ انھیں یہ نہ سُوجھا کہ سارا رزولیشن ہندو مسلم نزاعات کے طے کرنے کے متعلق تھا، اور اندھرا اور کرناٹک کو ان نزاعات کے ساتھ کسی قسم کا واسطہ نہ تھا ۔ سندھ کی مالی حالت کے متعلق کسی نے ایک حرف بھی نہیں کہا، اور نہ اس کی کوئی شرط لگائی گئی، اور لگائی جاتی بھی کیوں، اگر سندھ کی مالی حالت اچھی نہیں ہے تو اسے بمبئی کے احاطہ میں ملحق رکھ کر اس کا بار گجرات اور مہاراشٹر اور کرناٹک وغیرہ پر ڈالنا کیوں روا ہے اور سارے ہندوستان پر یا مرکزی حکومت پر اس کا بار ڈالنا کیوں ناروا ہو سکتا ہے ؟ باپ کا مال تو اولاد پر حرام لیکن بھائی کا مال بھائی پر حلال ؟ اقلیتوں اور اکثریتوں[۱] دونوں کے لئے نشستوں کے مخصوص

---

[۱] مولانا محمد علی کا یہ سیاسی سرگزشت جس کے وہ مرجع تھے، اپنی علالت کے زمانے میں تحریر فرمائی ہے، اور زیادہ سے زیادہ معروضی اسلوب میں حقائق کے رُخ سے پردہ اُٹھایا ہے تاکہ یہ حقائق افسانہ و افسوں نہ بن جائیں ۔ لہٰذا اس میں وہ ادبی شان نہیں جس سے اُن کی نگارشات میں جلال و جمال کا متوازن امتزاج پایا جاتا ہے لیکن تخلیقی ذہن اجتہاد سے نہیں چوکتا، اکثریت کی جمع اکثریتوں وہی بنانے کے مجاز تھے ۔ (نگار)

کئے جانے پر کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا۔ جب اسمبلی میں مسلمانوں کے لیے کم از کم ایک ثلث نشستیں مخصوص کرنے کا سوال پیش آیا تو پنڈت موتی لال نہرو نے فرمایا کہ اس طرح تو یہ چیز کسی اصول کے مطابق نہیں معلوم ہوتی" اور بے تکی سی ہے، اگر اسے اسی طرح رکھ دیا جائے کہ ہر صوبہ سے اسمبلی کے لئے بھی اسی تناسب سے مسلمان منتخب کئے جائیں گے، جس تناسب سے ان کے لئے صوبجات کی کونسلوں میں نشستیں مخصوص ہیں، تو یقیناً ایک ثلث نشستیں مسلمانوں کو مل جائیں گی۔ اس لئے کہ دہلی کی تجاویز میں یہ بھی رکھا گیا تھا کہ ہر صوبہ میں مسلم اقلیتوں اور نیز ہندو اقلیتوں کو باہمی سمجھوتے کے بعد تناسب آبادی سے زیادہ نشستیں دی جائیں گی" اور اس تجویز کے مجلس عامہ میں منظور ہو جانے کے بعد بلا کسی کی اجازت کے سری نواس آئینگر نے سکھوں کے لئے بھی اسی قسم کی رعایت کا اضافہ کر دیا، جس پر نہ میں راضی تھا، نہ ڈاکٹر انصاری، اور ہم دونوں نے اس کا سری نواس آئینگر سے ذکر بھی کر دیا کہ یہ ایک غلطی ہے" اس سے پنجاب کا مسئلہ پیچیدہ ہو جائے گا" اور اس کا ہندو مسلم نزاعات کے ساتھ کسی قسم کا تعلق بھی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ دستور کانگریس کی وہ شرط بھی رکھی گئی کہ اقلیت کی ۳/۴ اکثریت اگر کسی چیز کی اس بنا پر مخالفت کرے کہ وہ اس کے مفاد کے خلاف ہے تو وہ پیش نہ ہو سکے۔ مگر موتی لال جی نے اس ویٹو (VETO) کو "بین الملل امور" (INTER — COMMUNAL MATTERS) تک محدود کر دیا جو یقیناً ہر ایک کا منشا تھا، مگر اس کا فیصلہ کہ کون سا امر بین الملل ہے اور کون سا نہیں، ایک "بین الملل کمیٹی" پر چھوڑ دیا جو ہر سیشن کے شروع میں منتخب کی جائے، جس سے مجھے اتفاق نہیں۔ اس تمام تجویز کو موتی لال ہی نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسہ میں پیش کیا، اور انھیں نے اسے منظور کرایا۔ سب ہندو مہاسبھائیوں نے جو اس وقت موجود تھے، اسے منظور کیا، گو یا یاد رہے کہ جے رام داس صاحب اس جلسہ میں موجود نہ تھے، اور اس جلسہ کے فیصلے کی مخالفت بعد میں انھیں سے شروع ہوئی۔ ڈاکٹر منجے

نے صرف صوبہ سرحد کو اصلاحات دیئے جانے پر اس بنا سے اختلاف کیا کہ ان کی ہندو سبھا اس کے خلاف تھی۔ مگر جیکر نے اس میں کچھ شرطیں لگانے کی سعیٔ لا حاصل کے بعد، ایک معمولی ترمیم کو (جسے ہم نے بطیبِ خاطر قبول کر لیا) پیش کر کے منظور کر لیا۔

مگر اب موتی لال جی کی کایا پلٹ ملاحظہ ہو۔ مرکزی حکومت کو فرعونی و نمرودی اختیارات دے کر ان صوبوں کی حکومتوں کو جہاں بھول چوک سے کہیں مسلمانوں کی اکثریت باقی رہ جائے غلام بنانے کے بعد ہندو سبھائیوں کو کیا پڑی ہے جو وہ کسی صوبہ میں اپنی اقلیت کے لئے مزید نشستیں طلب کریں؟ لہٰذا مئی ۱۹۲۷ء کے کانگریس کمیٹی کے فیصلہ کو نہرو رپورٹ میں رد کر دیا گیا ہے اور مسلم اقلیتوں کو صرف اتنی ہی نشستیں ملیں جتنی کہ ان کی آبادی کے تناسب سے ان کے لئے مخصوص کر دی گئی ہوں۔ مسلم اکثریتوں کے لئے بھی کانگریس کمیٹی نے نشستیں مخصوص کر دی تھیں لیکن نہرو رپورٹ میں یہ بھی غائب۔ لہٰذا اسمبلی میں جو ہندو سبھا کا ہاؤس آف لارڈز یعنی دارالامرا ہوگا جہاں ہر وہ چیز منظور ہو سکے گی، جسے وہ صوبے منظور کریں۔

(۲۳)

۱۴ جنوری ۱۹۲۹ء

جس طرح کلکتہ کے فسادات نے ہمیں دہلی میں مئی ۱۹۲۶ء میں اسپیشل خلافت کانفرنس کرنے پہ مجبور کر دیا تھا، اسی طرح دناپور، بتیا، کلکاٹی اور پلاسی کے فسادات نے اور ان میں مسلمانوں پر جو ظلم توڑے گئے انہوں نے ہمیں مجبور کر دیا کہ میں کلکتہ کی خلافت کانفرنس کی صدارت کروں، اور اگرچہ نیوز ایجنسیوں اور اخباروں نے میرے زبانی خطبۂ صدارت کے ساتھ تقریباً وہی سلوک کیا تھا جو اس بار کیا گیا، باوجودیکہ میں نے گھنٹوں بے حد محنتِ شاقہ برداشت کر کے اس وقت بھی اپنے خطبۂ کا ملخص رپورٹروں کو نہ صرف شارٹ ہینڈ بلکہ لانگ ہینڈ میں بھی لکھوا دیا تھا، تاہم جن حضرات

نے میرا خطبۂ صدارت سُنا یا پڑھا ان کو یاد ہوگا کہ اس کا بڑا حصّہ اس مُہلک متعصّبانہ ذہنیت کو دُور کرنے کی کوشش کے لئے وقف کیا گیا تھا جو ڈاکٹر مونجے صدر ہندو مہاسبھا منعقدہ پٹنہ کے خُطبۂ صدارت میں ظاہر کی گئی تھی، جو اسی صوبہ میں ہندو مہاسبھائیوں کے فسادات کی شکل میں داناپور اور بتیا میں نمودار ہوئی اور جواب کلکتہ کے کنونشن اور کانگریس دونوں میں یکساں نمایاں تھی کہ ابھی سوراج لینا فضول ہے، اس لئے کہ ہندو اسے سنبھال نہیں سکتے، انھیں مل بھی گیا تو جلد ان کے ہاتھوں سے پھر نکل جائیگا۔ ابھی صرف مسلمانوں پر قابو پانے کا انتظام کیا جائے، اور ۱۸۵۷ء سے پہلے کے دہلی کے ڈھنڈورچی کی طرح پُکارا کرتا تھا کہ "خلقِ خدا کی، مُلک بادشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا" ابھی اسی کا بندوبست کیا جائے کہ "خلق خدا کی، ملک وائسرائے کا، اور حکم ہندو مہاسبھا کا ہو جائے۔ آزادی وغیرہ کا سوال اس کے بعد اُٹھایا جائے گا۔ بتیا کے واقعات کے جن پر مہاتما جی تک نے ربت نہ رکھا، نہ جنھیں مالوی جی اور لالہ جی آنجہانی نے کبھی ہندو مہاسبھائیوں کو تعصّب کا نمونہ سمجھ کر ان پر اظہارِ ندامت کیا، ہمیں مجبور کر دیا کہ ہم فوراً شملہ جائیں اور ایک بار ہندو مہاسبھائیوں کو یہ اچھی طرح سمجھا دیں کہ اگر وہ اسی طرح متعصّب ہنود کو شہ دے کر مسلمانوں کے خلاف اُبھارتے رہے اور ان پر ظلم توڑتے رہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک میں وہ خانہ جنگی ہو کر رہے گی جس کی طرف گذشتہ اکتوبر میں کانپور کی کانفرنس میں شوکت صاحب کو پھر اشارہ کرنا پڑا اور خلافت کی مجلسِ عاملہ کا جلسہ شفیع داؤدی صاحب کی قیام گاہ پر منعقد ہوا، اور ڈاکٹر انصاری اور شعیب قریشی صاحب اسی بنا پر ہمارے ایلچی مقرر کر کے ہندو مہاسبھا کے عہدہ داروں کے پاس بھیجے گئے، کہ اُن کے متعلق کسی ہندو کو یہ شبہ نہ ہوگا کہ یہ جذبۂ ملّت پرستی میں ڈوبے ہوئے ہیں، اور ہنود کے ساتھ انصاف نہیں کرتے[1]۔ بلکہ جب ایسے حضرات کو بھی اس الٹی میٹم کہ ان تک پہنچانے

---

[1] اللہ اللہ! ہندو مسلم اتحاد کے مولانا محمد علی سچے داعی تھے اور وہ ایک پکے مسلمان ہونے کی حیثیت

(بقیہ آگے صفحہ پر)

کے لیے سفیر کی صورت میں دیکھیں گے، تو وہ یقین کر لیں گے کہ ہمارے صبر کی کمان کو اب زیادہ نہ کھینچنا چاہیئے، ورنہ وہ ٹوٹ جائے گی۔ حیرت کا مقام ہے کہ ہمارے ان دو سفیروں میں ایک ڈاکٹر انصاری، دوسرے سفیر شعیب قریشی صاحب ... یہ رائے رکھتا ہے کہ وہ سخت متعصب اور فرقہ پرست مسلمان ہیں اور باوجودیکہ ہندو مہاسبھائیوں کی ذہنیت مطلق نہیں بدلی، ان کا شریک و معاون بن کر اپنے کو ان سے مرعوب سمجھتا بلکہ ان کو حق پرست بتلاتا ہے۔

خیر! اسے جانے دیجئے۔ شملہ کی خلافت کانفرنس منعقد ہوئی اور جس طرح ہندو سبھائیوں نے اسے توڑا، وہ سب کو معلوم ہے، اور جو بیان اس کی کارروائی کے متعلق شفیع داؤدی صاحب نے شائع کرایا تھا، اسے ڈاکٹر انصاری سب سے کم بھلا بیٹھے ہوں گے، اس کانفرنس کے منتشر ہو جانے کے بعد خدا بھلا کرے سری نواس آئینگر کا کہ اس غریب نے کلکتہ میں کانگریس کمیٹی کا جلسہ منعقد کیا، جس میں گائے اور باجے گاجے کے متعلق ایک مدبرانہ فیصلہ کیا۔ وہاں لالہ جی اور مالوی جی تشریف نہیں لائے، مگر وہاں بھی دو ہندو سبھائی آخر وقت تک لڑتے رہے، جن میں سے ایک اخبار "سوراجیہ" کے مالک اور اڈیٹر پرکاشم صاحب ہیں، اور دوسرے سندھ کے جے رام داس صاحب، جنہیں دہلی بلاکر مالوی جی نے "ہندوستان ٹائمز" کا اڈیٹر بنایا تھا۔ یہ پہلا جلسہ تھا، جس میں اپنی رہائی کے بعد سوباش بابو شریک ہوئے تھے، اور ان کی تکالیف اور ان کی قربانی ان کی لیاقت اور ان کے حسن کا سب کے دل پر اثر تھا۔ بالخصوص بنگال کے

پچھلے صفحہ کا بقیہ: میں بعض شعبوں خصوصاً ہندوستان کی آزادی اور سیاسی امور میں اس اتحاد کیلئے صدق دل سے کوشاں تھے۔ لیکن نہ صرف فرقہ پرست و متعصب ہندو یا مہاسبھائی بلکہ خود کانگریس بھی ہندو مسلم اتحاد کی خواہاں نہ تھی۔ کانگریس نے یہ نعرہ محض سیاسی ٹیکٹکس کے طور پر اختیار کیا تھا، اور درپردہ اور کھلم کھلا ہندو مہاسبھا کی شریک اور ممد تھی ..... سوراخ کی وجہ سے عبارت پڑھی نہ جا سکی (نگار)

دل پر، اس لئے ہندو سبھائیوں کی کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح اُن کو ہم سے بھڑوا دیا جائے، چنانچہ ایک سمجھوتہ کے ہو جانے کے بعد جب کسی نے مسلمانوں کو دبانا چاہا اور میں نے دبنا نہ چاہا تو اُنہوں نے نہایت ترش روئی کے ساتھ مجھ سے گفتگو کی، جس کا اُسی وقت میں نے معقول جواب بھی دے دیا۔ شعیب قریشی صاحب اس طرح دبائے جانے سے اتنے بیزار ہو گئے تھے کہ وہ تو شریکِ جلسہ بھی نہ ہوتے تھے، اور باوجود ان گہرے تعلقات کے جو ان کے اور ڈاکٹر انصاری کے درمیان پندرہ برس سے قائم تھے، وہ اس طرح باربار دبائے جانے پر ہرگز رضامند نہ تھے مگر ڈاکٹر صاحب کے اصرار سے وہ بھی شریکِ جلسہ ہو گئے۔ جب جلسہ بالآخر ایک اچھے نتیجہ پر پہنچ کر برخاست ہوا تو شب کو ایک عام جلسہ منعقد کیا گیا جس میں آخری تقریر میری تھی۔ الحمد للّٰہ کہ اس تقریر کا سوباش بابو پر اس قدر گہرا اثر پڑا کہ وہ باوجود اپنی علالت اور کمزوری کے رات کے بارہ بجے کے بعد اخبار "فارورڈ" کے دفتر میں خود پہنچے اور جہاں تک اُنھیں یاد رہی، میری تقریر خود رپورٹ کی اور صبح کے پرچے میں اُسے شائع کر دیا۔[۱]

اس کے بعد کانگریس کا مرحلہ تھا۔ ڈاکٹر انصاری اس کے صدر مُنتخب ہونے والے تھے، مگر آپ نے ایک انوکھی روش اختیار کی اور صدارت سے پہلے ہی ایک خُطبۂ صدارت شائع کرنا چاہا، جس کی مقبولیت کے بعد ہی آپ صدارت قبول کرنے پر راضی ہو سکتے تھے۔ اس خُطبہ کا مسودہ میری نظر سے بھی گذرا، اور میں اسے پڑھ کر دریائے حیرت و افسوس میں غرق ہو گیا، اس لئے کہ وہ ایک تارکِ تعاون ہی نہیں۔ سوراجی کی حیثیت سے بھی گرا ہوا تھا اور "جوابی تعاون" والے اور غالباً لبرل بھی اسے دیکھ کر پھُولے نہ سماتے۔ خدا بھلا کرے ایک سیدھے سادے تعاون والے کا جس نے اس بیان کو دیکھ کر ڈاکٹر صاحب

---

[۱] سوباش ایسے انقلابی کا یہ عمل واقعی عُلوئے کردار کا آئینہ دار ہے۔ (نگار)

کو سمجھایا کہ وہ ان سے کسی قدر غیر متوقع تھا۔ تب جاکر ڈاکٹر صاحب اس کی اصلاح کے لئے تیار ہوئے مگر یہ کہہ کر کہ ان کا حقیقی منشا بھی وہی تھا جو ہمارا تھا، چنانچہ ایک دوسری رُوح جہاں تک ہوسکا اسی قالب میں ڈھالی گئی، اور اگرچہ یہ بیان بھی غیر ضروری تھا، تاہم وہ اس قدر گرا ہوا نہ تھا، جس قدر کہ پہلا بیان، جس پر ہارنیمن نے "نیشنل ہیرلڈ" میں نہایت سختی سے تبصرہ کیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب صدر کانگریس منتخب ہوگئے، ان کا خطبۂ صدارت بھی ہر پہلو کو بچا کر لکھا گیا اور وہ مدراس میں رونق افروز ہوئے۔ کانگریس کی مجلس عامہ محض اس لئے کہ امور طے شدہ کی بخیہ نہ اُدھیری جائے، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسہ ہائے منعقدہ بمبئی، کلکتہ کی تجاویز ہندو مسلم تنازعات کے مٹانے کی تجویزیں رکھ کر بعینہٖ پیش کر دیا، اور اسی پر سب کا اتفاق ہوگیا۔ گو میں نے ایک امر کو پیش کرنا چاہا جو مسٹر جینا[1] کی غلطی سے تجاویز دہلی میں شائع ہونے سے رہ گیا تھا، اور وہ یہ تھا کہ پنجاب اور بنگال میں مسلم اور غیر مسلم رائے دہندگان کی تعداد ان کی آبادی کے تناسب ہی کے مطابق رکھی جائے، تاکہ دونوں صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت قائم رہے، نواب اسمٰعیل خاں اس کے شاہد ہیں کہ یہ تجویز صرف مسٹر جینا کے سہو کے باعث شائع ہونے سے رہ گئی۔ اس کا ذکر میں اس لئے کر رہا ہوں کہ جس چیز

---

[1] محمد علی جناح کو "محمد علی جینا" ہی لکھا جاتا تھا، نیز وہ اُس وقت تک "قائدِ اعظم" نہ کہلاتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر کی وفات کے بعد اُنھیں اخبارات نے "قائدِ اعظم" لکھا۔ "مدینہ" بجنور" جو مولانا محمد علی کے سیاسی عقائد کا شدید نکتہ چیں رہ چکا تھا، ۱۳ جنوری ۱۹۳۱ء صفحہ ۱ پر یہ سُرخی جماتا ہے "قائدِ اعظم کی وفات" ۔ ہندوستان جرائد کی حیاتِ غم ۱۹۳۵ء کے بلوچستانی اخبارات جو کراچی سے شائع ہوا کرتے تھے، ان میں سے بعض نے خان عبدالصمد خان اچکزئی کو "قائدِ اعظم" لکھنا شروع کیا، لیکن وہ بالآخر "بلوچستانی گاندھی" مشہور ہوئے۔ محمد علی جناح ان سب کے بعد "قائدِ اعظم" کہلائے اور یہ خطاب ان کے نام کا جزوِ لاینفک بن چکا ہے۔ (نگار)

پر آج بڑا زور دیا جا رہا ہے، وہ یہ ہے کہ نہرو کمیٹی نے ایک نئی دُنیا کا انکشاف کیا ہے، جس نے "پنجابی ٹولی" کی کایا پلٹ دی، اور نئی دُنیا ہر بالغ کو رائے دہی کا حق دیا جانا ہے، حالانکہ دہلی کی تجاویز ہی میں نہیں، بلکہ اس سے دو سال پہلے ۱۹۲۵ء کی ابتدا میں جو آل پارٹیز کانفرنس دہلی میں ہوئی تھی، اس میں اس تجویز کو اس وقت پیش کیا گیا تھا جب کہ ڈاکٹر کچلو اور ظفر علی صاحب کے دعاوی کے خلاف لاجپت رائے نے فرمایا تھا کہ پنجاب میں مسلم اکثریت ہے کہاں؟ آبادی میں وہ "بچونجا" ہوں مگر رائے دہندگان میں ان کی اکثریت نہیں ہو سکتی، ہندو زیادہ انکم ٹیکس دینے والے اور زیادہ تعلیم یافتہ ہیں، اور سکھ مالگزاری کا بڑا حصہ ادا کرتے ہیں۔ بہر حال ۱۹۲۸ء میں جب دہلی میں آل پارٹیز کانفرنس منعقد ہوئی تو اس کی وضع دستور کمیٹی نے سوائے مالوی جی کے یونہی سے اختلاف کے ہر بالغ کو حق رائے دہی دینے کا بااتفاق کامل فیصلہ کیا تھا، اور یہ "پنجابی ٹولی" کے سامنے اس وقت بھی تھی جب کہ وہ اپنی اکثریت کے واسطے نشستیں مخصوص کرانے کے لئے چھٹا دریا خون کا بہانے کے لئے اعلان کر رہی تھی۔

بہر حال مجلسِ عاملہ کی منظوری کے بعد یہ تجویز جیوں کی تیوں سبجکٹ کمیٹی میں پیش ہونے والی ہی تھی کہ مہاتما جی اپنے گوشۂ تنہائی سے برآمد ہوئے اور اُنہوں نے ڈاکٹر انصاری کو بلا کر فرمایا کہ میں تو صرف اس لئے حاضر ہوا تھا کہ کچھ تمہاری مدد کروں اور ہندو مسلم تنازعات کا آخری فیصلہ کروں، لیکن جب میں نے اس تجویز کو دیکھا جیسے مجلس عاملہ نے سبجکٹ کمیٹی میں پیش کرنے کے لئے تیار کیا ہے، اور جسے بمبئی اور کلکتہ کے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسوں نے منظور کیا تھا تو میرے ہوش اُڑ گئے۔ اس گائے والے حصہ پہ نہ تو میں، نہ کوئی ہندو راضی ہو سکتا ہے۔ وہ تو بالکل ہمارے مذہبی فرائض کے منافی ہے۔ مجھے رات بھر اس جنجال کے باعث نیند نہیں آئی کہ میں تو تمہیں مدد دینے کی بجائے ایک فیصلہ پر پہنچنے میں روک بن جاؤں گا مگر کیا کیا جائے؟ تم علی برادران کے پاس جاؤ اور ان سے یہ سب کچھ کہہ کر انہیں

بھی میرے پاس لاؤ۔ قصہ مختصر، ہم حاضر خدمت ہوئے اور مہاتما جی کے مذہبی خیالات
کا، جو کبھی ہمارے مذہبی خیالات نہیں ہو سکتے، ایک بار پھر اعادہ کیا گیا۔ اس
کے بعد ڈاکٹر انصاری کی قیام گاہ پر ایک طول طویل جلسۂ مشاورت ہوا،
جس میں مجبور ہو کر میں نے مہاتما جی کی منطق پر اعتراض کیا اور بالآخر میں انھیں
ایک ایسی چیز پر لے آیا جو انھیں بھی قبول تھی اور ہمیں بھی، اور ترمیم شدہ تجویز
سبجکٹ کمیٹی میں پیش ہوئی۔ اب وہاں، اس کے سیاسی جزو پر ہندو مہاسبھائیوں
اور مہاتما جی کے بعض پیروانِ خاص نے حملے کرنا شروع کئے، اور مالوی جی تو صبح کے
ڈھائی بجے تک روتے رہے۔ میں نے بھی تقریر کرنا چاہی، مگر ڈاکٹر انصاری نے
مجھے روکے رکھا۔ اور کہا کہ خود ہندو ہی ان ہندوؤں کو کافی جواب دے دیں گے۔
اور بہتر ہے کہ وہی ان مخالفین کو ساکت کریں۔ میں خاموش رہا۔ اور بالآخر مالوی جی
کو پے در پے شکستیں ملیں۔ اور صبح کو وہ اس پر راضی ہو گئے کہ اس تجویز کی تائید
کریں، ان کی تائیدی تقریر ہی میری اس تقریر کا باعث ہوئی تھی، جس میں میں نے
عرض کیا تھا کہ اگر مالوی جی اس طرح عملی کام بھی کریں تو ہم بھی مصر والوں کی طرح،
جنہوں نے ملنر کمیشن کا بائیکاٹ کیا تھا اور ہر سوال کے جواب میں یہی کہا تھا کہ
زاغلول پاشا سے پوچھو، جو اس کی رائے ہے، وہی ہماری رائے ہے، سائمن کمیشن
والوں سے کہہ دیں گے کہ جاؤ مالوی جی سے پوچھو، جو اُن کی رائے ہے، وہی
ہماری رائے ہے۔

مالوی جی کی اس تقریر کے بعد کسی نے مہاتما جی کو یہ غلط خبر جا کر سنادی کہ میں
نے نعوذ باللہ من ذالک، مالوی جی کے قدموں پر سجدہ کیا۔ مہاتما جی نے ہمیشہ
مالوی جی کو سراہا، اور ہمیشہ اس سے انکار کیا کہ وہ مسلمانوں کے بہی خواہ نہیں۔
بلکہ بدخواہ ہیں۔ افسوس ہے کہ وہ اسلام سے اور ہم سے ۱۹۲۷ء کے آخر تک
اتنے ناآشنا رہے کہ انہوں نے باور کر لیا کہ میں نے مالوی جی کو سجدہ کیا ہوگا۔ یا
ان کے قدموں پر اس طرح سر رکھا ہوگا جس طرح احمد آباد میں آل انڈیا

کانگریس کمیٹی کے جلسہ میں ان کے خلاف رولنگ پر ان کے رو پڑنے کے بعد میں نے رو کر ان کے قدموں پر سر رکھ دیا تھا۔

خیر جو کچھ بھی ہو، اب تو یہ یقینی ہے کہ مالوی جی نے نہرو کمیٹی کی رپورٹ کو جو مدراس کانگریس کی تجویز کے سراسر خلاف تھی پُوری طرح تائید فرمائی اور ان کی مدراس کانگریس کے فیصلہ سے روگردانی کی، مجھے بھی اس کا حق دیتی ہے کہ ان سے روگرداں ہو جاؤں۔ افسوس اگر ہے تو اس کا کہ مہاتما جی بھی مدراس کے اس فیصلہ سے روگرداں ہو گئے۔ جس میں آخر وقت خود مداخلت بے جا کر کے انہوں نے ترمیم کرائی تھی۔

(۴)

۱۵ر جنوری ۱۹۲۹ء

مدراس کانگریس کے بعد کلکتہ میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس سے پہلے اعضائے مسلم لیگ میں ایک سخت تنازعہ واقع ہو چکا تھا، اور آخر وقت تک یہ امر مشتبہ تھا کہ مسلم لیگ کا اجلاس کلکتہ میں منعقد بھی ہو گا یا نہیں؛ جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے، کانگریس والے تو اس اصول ہی کے قائل نہ تھے کہ ہندوستان کا دستور اساس سوائے ہندوستان والوں کے کوئی دوسرا بنائے۔ اس لئے وہ تو کسی ایسے کمیشن کو بھی قبول نہیں کر سکتے تھے، جس کے تمام اعضاء ہندوستانی ہی ہوں۔ لیکن جب سائمن کمیشن کے سب کے سب اعضاء انگریز مقرر ہوئے۔ تو لبرل فیڈریشن اور مسلم لیگ کے صدر نے بھی اس کے بوائیکاٹ کی ٹھان لی، مگر سر محمد شفیع اب بھی اس پر راضی نہ ہوئے۔ انہوں نے اور ان کے رفقاء نے لاہور میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس کرانا چاہا، اور لطف یہ کہ

ان رفقار نے انہیں کو اس اجلاس کا بھی صدر بنانا چاہا، حالانکہ دستور یہ ہے کہ جس صوبے میں مسلم لیگ کا یا کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا کرتا ہے، اس صوبہ سے کسی عضو کو صدر نہیں بنایا جاتا، مسلم لیگ کے دیگر اعضاء نے سر آغاخان کو صدر بنانا چاہا، اور گو مسٹر جینا نے پسند نہ کیا کہ مسلم لیگ کا اجلاس مدراس میں منعقد ہو، جہاں ہندو مسلم تنازعات کا فیصلہ باہمی مفاہمت سے ہو جاتا، تاہم انہوں نے کلکتہ کی دعوت کو قبول کر لیا، اور اس کا امکان ہو گیا کہ مدراس کی کانگریس سے فارغ ہوتے ہی ہم کانگریس والے بھی مسلم لیگ کے اجلاس میں شریک ہو جائیں، اور اس کا اجلاس بھی بڑے دن کی تعطیلوں ہی میں منعقد ہو جائے، قیام اجلاس اور صدارت کے انتخاب کے بارے میں مسلم لیگ کی کونسل میں جو تنازعات واقع ہوئے، اس کا دہرانا ضروری نہیں، صرف اس قدر عرض کر دینا کافی ہوگا کہ سر محمد شفیع اور ان کے رفقار نے کلکتہ کے اجلاس میں شرکت کو گوارا نہ کیا، اور خود لاہور میں ان کی صدارت میں مسلم لیگ کے اجلاس کے نام سے ایک جلسہ منعقد کیا، اس کے باعث مسٹر جینا سخت پریشان تھے کہ کلکتہ میں مسلم لیگ کا اجلاس بھی ہو سکے گا یا نہیں، اور وہ ہم کانگریس والے مسلمانوں کی اعانت کے محتاج تھے۔[1] اس وقت سر عبدالرحیم کو بھی حکومت پرستوں نے توڑ لیا تھا، اور سخت اندیشہ تھا کہ مسلم لیگ کی کونسل کلکتہ کے اجلاس کے خلاف فیصلہ نہ کر دے۔ ڈاکٹر انصاری کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ وہ مسلم لیگ کے کس قدر خلاف تھے، اور اس کو کس قدر بے حقیقت سمجھتے تھے۔ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ اسی علی گڈھ والے اجلاس میں جس میں انہوں نے

---

[1] گویا "کانگریس" اور "مسلم لیگ" کے مسلمان اراکین کے مابین ربط و ضبط قائم تھا اور وہ خلیج حائل نہ ہوئی تھی جو بعد میں ہوئی، نیز مولانا محمد علی جوہر نے اس نازک دور میں مسلم لیگ کا ساتھ دے کر حکومت پرستوں کی ریشہ دوانیوں کا سدِ باب کیا۔ (نگار)

ہماری معیت میں بھی شرکت گوارا نہ کی تھی، جو سلوک شوکت صاحب اور میرے ساتھ کیا گیا تھا' اس نے ہمیں بھی اس قدر بددل کردیا تھا کہ ہم بھی آئندہ کے لئے طے کرچکے تھے کہ اب اس میں شریک نہیں ہوا کریں گے' وہی سر علی امام جو آج پنڈت موتی لال نہرو اور ڈاکٹر انصاری کے دستِ و بازو بنے ہوئے ہیں' علی گڈھ کے اجلاس میں ہم سب کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ اور اُنھیں نے مسلم لیگ کی پُرانی تجویز کو اس اجلاس میں پیش فرمایا تھا' اور لُطف تو یہ ہے کہ وہی سیٹھ یعقوب حسن صاحب جنھوں نے نہرو کمیٹی کے دستور اساس کی بنیاد تجویز کی بھی کلکتہ کنونشن میں تائید فرمائی' اور جنھوں نے باوجود جمعیتِ خلافت کے نائب صدر ہونے' اس کی صدارت کو ٹھکرا کر ایک جماعت کو اس کا نمائندہ بنا کر کنونشن میں بھیجا اور ہمارے خلاف از سرتاپا جھوٹے بیان کو اخبارات میں شائع کردیا انھیں نے علی گڈھ کے اجلاس میں سر علی امام کی تجویز کی تائید کی! میں نے جو ترمیم پیش کی اسے سر عبدالرحیم نے جو صدارت فرما رہے تھے مسٹر جینا کے ایما سے بے قاعدہ ٹھہرا دیا اور اس لئے مجھے مجبور کیا کہ میں سر علی امام کی پیش کردہ تجویز کی مخالفت کروں۔

موصل کے مسئلہ میں جو تجویز بالآخر مسلم لیگ سبجکٹ کمیٹی نے منظور کی' اس کو بھی مطبوعہ پروگرام کے خلاف اس اجلاس میں اس وقت پیش کردیا گیا جب کہ ہم نمازِ ظہر کے لئے باہر گئے ہوئے تھے تاکہ ہم اس پر تقریر بھی نہ کرسکیں' اور حکومت پرستوں کی وفاداری کے جذبہ کو ذرا سی بھی ٹھیس نہ لگنے پائے' اس تمام کارروائی کے بعد ہم نے ڈاکٹر انصاری کی طرح فیصلہ کرلیا تھا کہ اب "مسلم لیگ" میں ہرگز شریک نہ ہوا کریں گے' اس کا دستور اساس اس قدر انوکھا ہے کہ اس جمعیت کو کوئی بھی مسلمان یا کسی جماعت کا نمائندہ نہیں کہہ سکتا' اس لئے کہ اس کے اعضاء کا انتخاب جو اس کی کونسل دو اعضاء کی نامزدگی پر کیا کرتی ہے' اور کانگریس یا جمعیتِ خلافت کی ہر طرح عاقل و بالغ ایک مقرر فیس دے کر اس کا عضو نہیں بن سکتا' اسی لئے

جمیعت خلافت نے مئی ۱۹۲۶ء کے اسپیشل اجلاس منعقدہ دہلی میں مسلمانوں کے شعبۂ سیاسی کو بھی اپنے ذمہ لے لیا تھا تاکہ ہر وہ عاقل و بالغ مسلمان جو اس کے مقاصد کو قبول کر کے ۴ر سالانہ چندہ دیا کرے اس کا عضو بن سکے۔ اور اس طرح جب اس کے اعضاء ضلعوں اور صوبوں کی جمعیتوں کی طرف سے نمائندے منتخب کریں اور مرکزی کمیٹی اور کانفرنس کے اعضاء چُنے جائیں تو وہ ملّتِ اسلامیہ کے صحیح نمائندے ہو سکیں۔ اس کے بعد مسلم لیگ کو مسلمانوں کی سیاسی نمائندگی کرنے کا کسی طرح بھی اہل نہیں سمجھا جا سکتا تھا، اور جمعیتِ خلافت ہی اس کی اہل کہی جا سکتی تھی۔ تاہم ڈاکٹر انصاری کو اور ہمیں اس کا ضرور احساس تھا کہ جس لیگ کی ہم نے سالہائے گذشتہ میں خدمت کر کے ایک ساکھ قایم کی تھی، اسی کے جسدِ بے رُوح کو چند حکومت پرست، جن کا مسلمانوں کی جماعت نے برسوں سے انتخاب نہیں کیا تھا، استعمال کر کے سائمن کمیشن کے روبرو ملّتِ اسلامیہ کے نمایندے بن کر پہنچ جائیں گے۔ اس لئے ہم لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس موقعہ پر اس میں شریک ہوں اور اس کو اس حکومت پرستی اور غلامی کے مظاہرے سے بچائیں۔ چنانچہ ڈاکٹر انصاری تو صدارتِ کانگریس کی مجبوری سے ایک دن اور مدراس میں مقیم رہے، مگر ہم کانگریس کے اس فیصلہ کے بعد ہی جسے مالوی جی جیسے ہندو مہاسبھائی نے بھی بالآخر تسلیم کر لیا تھا عازم کلکتہ ہو گئے اور مسلم لیگ کی کونسل کے اجلاس میں شریک ہو کر ہم نے اپنے براہین و دلائل اور اپنی اکثریت کے زور سے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کو کلکتہ ہی میں منعقد کرایا، اور اس میں ہم بھی شریک ہوئے اور ڈاکٹر انصاری اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی۔ گو میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ دونوں حضرات اس کے اعضاء بھی تھے یا نہیں، آج جبکہ نہرو کمیٹی کی رپورٹ کی حمایت میں زبردستی ملّتِ اسلامیہ کا نام لیا جا رہا ہے اور جمعیت خلافت اور مسلم لیگ دونوں کی اکثریت کو کسی نہ کسی طرح اس کے نارَوا فیصلوں کا مؤید ثابت کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، اور اگرچہ کلکتہ کے کنونشن کو کامیاب نہیں بنایا جا سکا، مگر اُمید کی جا رہی ہے کہ گرمیوں میں مسلم لیگ کو کسی طرح کثرت ہوت

کر کے اس فیصلہ کے موافق ظاہر کیا جا سکے گا ۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں مُسلم لیگ کی حقیقی حیثیت کے متعلق اپنے اور ڈاکٹر انصاری اور ان کے رفقاء سب کے ان خیالات کا اظہار کر دوں جن کے ساتھ ہم کلکتہ کے اجلاس منعقدہ دسمبر ۱۹۲۷ء میں شریک ہوئے تھے ۔

اب اس اجلاس کی داستان بھی سُن لیجئے اور سمجھ لیجئے کہ کس دقت کے ساتھ میں نے باوجود مسٹر جنیا اور ان کے دست و بازو اور وطن پرست مسٹر چاگلا کے تذبذب بلکہ ایک حد تک مخالفت کے بعد مسلم لیگ کو مشروط مخلوط انتخاب پر راضی کیا تھا[۱]۔ مسٹر جنیا، سر محمد شفیع کی کارروائی سے سخت پریشان ہو رہے تھے، اور جب میں نے مشروط مخلوط انتخاب کی تجویز پیش کرنا چاہی تو انہوں نے مجھے روکنا چاہا اور کہا کہ "مسلم لیگ" میں یُوں ہی تفریق ہو گئی ہے، اور اس کا ایک ٹکڑا لاہور میں اجلاس کر رہا ہے، اگر ہم نے مخلوط انتخاب کا اس وقت نام بھی لیا تو یہاں دوسرے ٹکڑے میں بھی سخت اختلاف واقع ہو جائے گا اور ہماری جماعت بھی مُنتشر ہو جائے گی ۔ اس وقت مصلحت یہی ہے کہ مخلوط انتخاب کا مسئلہ پیش نہ کیا جائے، صرف سائمن کمیشن کے مقاطعہ کی تجویز ہی یہاں پیش کر دی جائے ۔ میں نے کہا کہ مسلمان اس وقت ہدایت کے محتاج ہیں۔ اگر آپ ان کے ہادی ہیں، تو ہدایت سے کنارہ کشی نہ کیجئے (وہ تمام دلائل و براہین جو گذشتہ مارچ میں سر برآوردہ مسلمانوں کے سامنے دہلی میں پیش کی گئی تھیں، اور

---

[۱] مولانا محمد علی جوہرؔ "مخلوط انتخاب" کو اس شرط کے ساتھ مانتے تھے کہ ہر اُمیدوار کو اپنے حلقہ ہائے نیابت میں کم از کم ۴۰٪ ووٹ اپنی کمیونٹی (اگر ہندو ہے تو ہندو اور اگر مسلمان ہے تو مسلمان) سے حاصل کرنا چاہئے اور ۱۰٪ دیگر ۔ ظاہر ہے کہ اس میں بھی جُداگانہ انتخاب کی ایک ادا پائی جاتی ہے ۔ اور یہ وہ دَور تھا کہ برصغیر میں مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کا حل تلاش کیا جا رہا تھا اور یہ حل بقول اقبالؒ WITH IN INDIA ہی تلاش کیا جا رہا تھا ۔ (نگار)

جنہوں نے سر محمد شفیع تک کو قائل کر دیا تھا، آج اعضائے مسلم لیگ کے سامنے بھی پیش کر دی جائیں گی، تو مجھے یقین ہے کہ وہ بھی دہلی کی تجاویز کی طرح منظور کر لیں گے۔ اگرچہ مسٹر جینا بھی اس پر مذبذب ہوئے مگر میں نے وہ پوری تجویز سبجکٹ کمیٹی میں پیش کر دی، جس کو مدراس کانگریس منظور کر چکی تھی۔ میں نے اس وقت پر تقریر نہ کی اور اپنے حق تقریر کو محفوظ رکھ کر سر علی امام سے اس کی تائید کرائی، جناب موصوف نے اس کی تائید میں کوئی پُر زور تقریر نہیں فرمائی، تاہم یہ تجویز باضابطہ پیش ہو گئی۔ پنجاب سے ملک برکت علی صاحب سر محمد شفیع کی جماعت سے کسی باعث علیحدہ ہو چکے تھے، مگر اس وقت تک وہ اہلِ پنجاب کی طرح مخلوط انتخاب کے نام سے بھی لرزاں تھے۔ انہوں نے اس تحریر کی مخالفت میں ایک نہایت زور دار تقریر کی۔ چونکہ رات زیادہ گذر چکی تھی، میری تقریر دوسرے دن کے لئے ملتوی کر دی گئی۔

دوسرے دن اعضائے سبجکٹ کمیٹی جلسہ کی ابتدا کے وقت بڑی تعداد میں نہ آئے تھے، اس لئے مولوی محمد یعقوب صدرِ اجلاس اور مسٹر جینا نے مناسب سمجھا کہ میری تجویز پر ابھی بحث نہ کی جائے، بلکہ چند اور کم اہم تجاویز پیش کر کے انھیں جلد منظور کرا لیا جائے۔ میں نے ان پر کوئی اعتراض نہیں کیا، مگر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ اسی وقت ایک تجویز مسٹر چاگلا نے بھی پیش کرا دی جو اگر منظور ہو جاتی تو میری تجویز منظور نہ کی جا سکتی تھی، اس پر میں نے بے ضابطگی کا اعتراض اُٹھایا تو مسٹر جینا نہایت بگڑ کر بولے کہ جس تجویز سے مسٹر محمد علی کو اتفاق نہیں ہوتا اُسے وہ بے ضابطہ قرار دے دیا کرتے ہیں۔ میں نے اس اندازِ گفتگو پر اعتراض کیا اور اصرار کیا کہ صدرِ اجلاس میرے اعتراض پر فیصلہ صادر کریں، اس پر مسٹر جینا نے پھر بگڑ کر کہا کہ یہ مداخلتِ بے جا ہرگز روا نہیں اور مسٹر چاگلا کی تجویز پر بحث ہونا چاہئے۔ جب میں نے صدرِ اجلاس سے اجازت چاہی کہ میں اپنے اعتراض کے واجبی ہونے کے ثبوت میں دلائل پیش کروں تو مسٹر جینا نے اور بھی سخت کلامی سے کام لیا اور کہا کہ میں ہرگز گوارا نہیں کر سکتا کہ سینہ زوری کے ساتھ مجھے دبا دیا جائے۔ "I do not want to be bullied."

جس کا جواب میں نے بھی اسی طرح دیا۔

"I, too, do not want to be bullied."

(میں بھی اسے ہرگز گوارا نہیں کر سکتا کہ سینہ زوری کے ساتھ مجھے دبا دیا جائے)

اس تُو تُو میں میں کے بعد صدرِ اجلاس نے مجھے اجازت دی کہ اپنے دلائل پیش کروں اور میں نے سبجکٹ کمیٹی کو بتایا کہ جب ایک تجویز ایوان کے سامنے پیش کر دی گئی ہو تو کوئی دوسری تجویز اس کے بعد ایسی پیش نہیں کی جا سکتی۔ اگر کسی عضو کو پہلی تجویز سے اختلاف ہے تو وہ اس کی مخالفت کر سکتا ہے، یا اس میں کوئی ترمیم پیش کر سکتا ہے اور اگر اس کے خلاف فیصلہ کرنا مقصود نہیں ہے، محض اس پہلی تجویز پر مباحثہ کو ملتوی کرنا مدِ نظر ہے تو اس کے لئے ضابطہ یہ ہے کہ ایک تحریک اس تجویز پر مباحثہ کے التوا کی پیش کی جا سکتی ہے، اور اب میں اپنی تجویز پر تقریر کرنا چاہتا ہوں۔ مولوی محمد یعقوب نے بظاہر اس سے اتفاق کیا، اور بہر حال مجھے اس کی اجازت ملی کہ میں شبیہ ما قبل کی پیش شدہ تجویز پر تقریر کروں، اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ ملک برکت علی بھی میرے ہم رائے ہو گئے اور ظفر علی خاں صاحب اور داؤد غزنوی صاحب نے بھی اتفاق کیا، مگر میری تجویز کے الفاظ میں اس طرح تو ترمیم کرانا چاہی کہ جب تک وہ شرائط پوری نہ ہو جائیں جو دہلی تجاویز میں شامل تھیں، اور جنہیں موتی لال جی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس منعقدہ بمبئی میں گذشتہ مئی میں بہ اسلوبِ دیگر منظور کرا چکے تھے، اور جنہیں اب مدراس کانگریس نے بھی اس اسلوب کے ساتھ منظور کر لیا تھا، تب تک مسلمان جُداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے چھوڑنے پر کسی طرح راضی نہیں ہو سکتے، ڈاکٹر انصاری کئی بار خود اس کو تسلیم کر چکے ہیں کہ مدراس کے اجلاس نے جس تجویز کو ان کی زیرِ صدارت مالوی جی کی تائید کے بعد منظور کیا تھا، اس کا منشا بھی یہی تھا کہ تمام تجاویز ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں اور سب پر ایک ہی وقت عمل ہوگا۔ یہ نہیں کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کی جگہ تو مخلوط حلقہ ہائے انتخاب فوراً قائم کر دیئے جائیں مگر سندھ

کی علیحدگی یا صوبہ سرحد میں اصلاحات کا اجراء عمل میں نہ لایا جائے یا بعد میں عمل
میں لایا جائے مگر تجویز کا یہی جز تھا جس کی بنا پر لالہ جپت رائے اور دوسرے
ہندو مہا سبھائیوں نے آل پارٹیز کانفرنس منعقدہ دہلی میں بار بار کہا کہ کلکتہ
مسلم لیگ کی تجویز وہ نہیں ہے جو مدراس کانگریس کی تجویز ہے۔ بہر حال میں
نے اس لفظی ترمیم کو قبول کیا، اور بالآخر مسٹر جینا بھی راضی ہو گئے، اور انہوں
نے اس تجویز کے دیباچہ پر چند الفاظ اس قسم کے بڑھا دیئے کہ مندرجہ تحت تجویز
کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مسلم لیگ کے نمائندے کانگریس کی مدعو کردہ آل پارٹیز
کانفرنس کے مباحثہ میں حصہ لیں۔ میں نے اسے قبول کر لیا، اور جب اس طرح
ترمیم شدہ تحریک پر عام جلسہ میں بحث شروع ہوئی تو جُداگانہ حلقہ ہائے
انتخاب کے ہمدردان جلد ہی ہار مان گئے۔ مسز بسنت نے فرمایا کہ میں اپنے
ان رفقائے پارلیمنٹ کو جو میرے کامن ویلتھ بل کو دارالعلوم میں پیش کر چکے
ہیں اطلاع دے دوں گی کہ وہ بھی سندھ کی علیحدگی اور صوبہ سرحد میں اصلاحات
کے اجراء کے ساتھ مخلوط انتخابات کو مشروط کر دیں، ورنہ میں اس کی منظوری
پر راضی نہ ہوں گی۔ پنڈت مدن موہن مالوی نے بھی مسلمانوں کے اس فیصلہ پر
اظہارِ خوشنودی و شکر گذاری فرمایا، اور سب سے زیادہ اہم بات یہ ہوئی
کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اس تجویز کی تائید میں تقریر فرمائی اور میرے
اس خیال کی تائید فرمائی کہ مسلم اقلیت کے حقوق پہلے محفوظ نہ تھے، لیکن جب
پانچ صوبوں میں ان کو بھی اکثریت حاصل ہو جائے گی تو ان کے حقوق محفوظ
ہو جائیں گے، افسوس ہے کہ جب ہندو اخبارات نے ہندو مسلم اتحاد کے اس
مقبول ترین حامی پر اس کے بعد اعتراضات کرنا شروع کئے کہ لو، اب تو
یہ بھی علی برادران اور مسلم لیگ والوں کی طرح مُسلم حقوق کی حفاظت کے
خواستگار ہیں، اور اس کے لئے مسلمانوں کی بھی پانچ صوبوں میں اکثریت قائم
کرنا چاہتے ہیں تو مولانائے موصوف ایک مبہم سی تردید اخبارات میں شائع کرادی۔

بہرحال، یہ تجویز مسلم لیگ میں ڈاکٹر انصاری کی موجودگی میں پیش ہوئی اور اگرچہ سائمن کمیشن کے مقاطعہ کے خلاف چار ہاتھ اُٹھے تھے، مگر اس تجویز کے خلاف باوجود مسٹر جینا کے خوف کے کسی کا ہاتھ نہ اُٹھا، اگر اُٹھا تو رفیع قدوائی صاحب کا جو اس تجویز کے ان الفاظ سے اختلاف رکھتے تھے، جنہیں اہلِ پنجاب کے پیش کرنے پر میں نے قبول کر لیا تھا۔

میں خوش ہوں کہ میری اس تجویز کو مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری، مسز بسنت، مالوی جی، مسٹر جینا اور مسٹر چاگلا نے بھی قبول فرمایا، لیکن میں اس کا ادعا کرتا ہوں کہ جن شرائط کے ساتھ بھی مخلوط انتخابات کو مسلم لیگ اور مسلمانوں کی ایک وسیع جماعت نے قبول کیا، ان سے ان انتخابات کو قبول کرانے والا حقیقتاً صرف ایک شخص تھا اور اس کا نام محمد علی ہے۔ مسلم لیگ صوبجات متحدہ کے سالانہ اجلاس منعقدہ میرٹھ میں بھی اسے میں نے ہی منظور کرایا تھا، حالانکہ میں اس وقت اس کا ایک عضو بھی نہ تھا، اور کلکتہ میں بھی اسے میں نے ہی منظور کرایا، اس کی تائید میں میں نے ہی "ہمدرد" کے کالم کے کالم سیاہ کئے تھے، اور بعض مرتبہ تو اس کے روزانہ پرچے صرف اسی وجہ سے دوسرے دن کی ڈاک میں ڈالے گئے تھے کہ میرا مضمون باوجود پانچ چھ کالم سے بھی بڑھ جانے کے کسی قدر تشنہ رہ جاتا تھا، اور میں نہ چاہتا تھا کہ جو مسلمان آنے[1] اسی دن کا پرچہ خریدے وہ پوری طرح قائل ہونے سے رہ جائے اور مجبور ہو کر مغرب تک مضمون لکھتا رہتا تھا، اگرچہ میں جانتا تھا کہ اس طرح بہت سے دوسرے ضروری مواد کو اس دن کے پرچے سے نکالنا پڑے گا اور مضمون بے حد طویل ہو جائے گا اور اخبار وقت پر نہ چھپ سکے گا۔

پٹنہ میں جس طرح لڑ جھگڑ کر، سمجھا بجھا کر، منت سماجت کر کے، وہ دلائل و براہین دے کر، ہنسا ہنسا کر، رُلا رُلا کر میں نے مخلوط انتخاب کی تجویز کو منظور کرایا،

---

[1] ایک آنہ، ہمدرد کا سالانہ چندہ ۳۵ ؍ششماہی ۱۸ ؍ اور فی پرچہ ایک آنہ ہوا کرتا تھا۔
(دورِ ثانی)

اس سے بھی بعض وہ پُرانے احباب اور رفقائے کار نا واقف نہیں جو آج مخالفین ہی نہیں بلکہ اعداء کے زمرے میں نظر آ رہے ہیں، اور مجھ پر تبرّا بھیج رہے ہیں۔ پھر کلکتہ کی خلافت کانفرنس کا کیا ذکر کروں ؟ لیکن ہمارے مخالفین سب اصول کے پابند، حق گو اور حق پرست ہیں اور ہم غدار ہیں، ہم مکار ہیں، اوباش ہیں، غنڈے ہیں، ہندو مسلم اتحاد کے دشمن ہیں، حکومت پرست ہیں اور حکومت پرستوں کے زیرِ سایہ زندگی کے دن گزار رہے ہیں۔ ہندو اخبارات سے اور روزانہ "زمیندار" سے تو شکایت ہی کرنا فضول ہے، ان کے ایمان اور عملِ صالح کا قائل ہی کون تھا ؟ مگر جب عمر بھر کی دوستیاں کچے دھاگے سے بھی زیادہ کمزور ہوں تو سوائے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھنے کے چارا ہی کیا ہے ؟ شکرِ خدا کہ کم از کم اس پر آج بھی اسی طرح یقین ہے، جس طرح پہلے تھا کہ ہمارے ہی صبر و شکر کے لئے یہ صلہ مقرر فرمایا گیا ہے کہ اولئک علیہم صلوٰۃ من ربہم و رحمتہ الخ ۔

(ہمدرد ۔ ۱۰، ۱۳، ۱۴، ۱۵ جنوری ۱۹۲۹ء)

قطعۂ تاریخِ وصال

ضیاء بدایونی

غربت میں جب شہید محمد علی ہوئے ۔۔۔ فرطِ الم سے حالِ ضیاءؔ غیر ہو گیا
فکرِ سنہ وصال ہوئی جب تو غیب سے ۔۔۔ آواز آئی خاتمہ بالخیر ہو گیا

مولانا محمد علی جوہر

ہمدرد
کا
الوداعی اداریہ
(ماخوذ)

ہمدرد کو بند کرتے ہوئے اس کی آخری اشاعت میں مولانا محمد علی نے معاصرِ موصوف کے خسارے کی داستان دُہرا کر اپنے ارادہ اور مستقبل کے متعلق حسبِ ذیل مضمون سُپردِ قلم فرمایا تھا:۔

"اب سوائے اس کے کیا چارہ ہے کہ میں" ہمدرد" کو بند کر دوں اور اس پیہم خسارے کے بار سے سُبک دوشی اختیار کروں! میرا ارادہ تھا کہ میں دہلی میں ایک چھوٹے سے مکان میں قیام کرتا اور ہر روز دو تین گھنٹے یا ہفتہ میں دو تین دن کسی کا کام کر کے اتنا پیدا کر لیا کرتا کہ میں اور میرے بال بچے قوتِ لایموت سے محروم نہ رہیں۔ باقی وقت خود کچھ سیکھتا۔ کچھ اپنی لڑکیوں اور بیوی کو سکھاتا۔ جن کی تعلیم سے میں طوعاً نہیں بلکہ کرہاً، اب تک غافل رہا ہوں۔ اور جو وقت بچتا اس میں ایک مُفلس و نادار شخص کی حیثیت کے مُطابق ملک و ملت کا کام کرتا۔ مگر میری غیر حاضری میں میرا بہ حیثیت صدر جمعیتِ خلافت انتخاب کیا جا چکا ہے۔ اور میں مجبور ہوں کہ امسال اور ملک میں گشت لگاؤں اور جمعیت خلافت کے مقاصد سے مسلمانوں کو آگاہ کروں۔ اور اُنھیں ہر گاؤں اور ہر شہر کے ہر محلہ میں خلافت کمیٹیاں قائم بچوں کے لئے ابتدائی اور عمر رسیدہ لوگوں کے لئے شبینہ مدارس قائم کرنے پر آمادہ کروں، اور اسی سلسلہ میں کل ان شاء اللہ بمبئی جاؤں گا اور وسط مئی میں

وہاں سے واپسی پر انشاءاللہ مسلمانانِ جنوبی افریقہ کی دعوت پر وہاں پر جاؤں گا۔اور ہندوستان آکر مختلف صوبجات میں اور بالخصوص سندھ اور پنجاب میں دَورہ کروں گا۔

لیکن جو کام اب میں نے ساری عُمر کے لئے اپنے لئے تجویز کرلیا ہے، خواہ وہ دہلی میں بیٹھ کر کیا جائے یا کہیں اور جاکر وہ پہلے مسلمانوں میں اور ساری دُنیا میں فکرِ اسلامی پیدا کرنے اور کفر و الحاد کے اس سیلاب کے مقابلہ کرنے کا ہے جو یُورپ سے وطن پرستی اور جنسیت و قومیت کی شکل میں اُمڈا آرہا ہے۔ اور جو ترکی اور ایران، شام اور عراق ہی میں نہیں بلکہ افغانستان اور ہندوستان میں بھی نوجوان مسلمانوں کو خدا اور آخرت دونوں سے انکار کی طرف مائل کر رہا ہے۔

اسلام ہرگز حُبِّ وطن اور غیر مُسلموں کے ساتھ آزادی اور حُرّیت اور بنی نوعِ انسان کی خدمت میں تعاون کرنے کے خلاف نہیں۔ اور اس معنی میں ہر مسلم کو مُلک پرور اور مُحبِ وطن بننا لازمی ہے اور خدا نہ کرے کہ وہ دن آئے کہ مسلمانانِ ہند اپنی موجودہ غُلامی پر راضی ہو جائیں یا اپنے غیر مسلم بھائیوں سے نفرت کو اپنے دلوں میں جاگزیں ہونے دیں۔ اور اُن کے ساتھ ذرا بھی ناانصافی کو رکھنے لگیں۔ لیکن کوئی مسلم اس حُبِّ وطن اور جنسیت و قومیت کا ہرگز قائل نہیں ہوسکتا جو عرب کو عجم سے ترک کو تاجیک سے یا ہندی کو افغانی سے جُدا کرے۔

کان الناس امۃ واحدۃ فبعث اللہ النبیین مبشرین و منذرین وانزل معھم الکتب لیحکم بین الناس فی ما اختلفوا فیہ، خداوندِ کریم نے تمام انسانوں کو ایک ہی قوم بنایا تھا، پھر ان میں اپنے انبیا اس غرض سے مبعوث فرمائے تھے کہ وہ نیکوکاروں کو فلاح دار بننے کی خوشخبری سُنائیں اور بدکاروں کو دنیوی تباہی اور اخروی رسوائی سے ڈرائیں۔ اور اسی لئے ان کے ساتھ صحفِ سماوی نازل فرمائے۔ تاکہ جن امور میں لوگوں میں اختلاف پیدا ہوگیا تھا، ان میں سب کو راہِ راست دکھاکر اس اختلاف کو مٹائیں۔ اور دُنیا میں پھر امن و آشتی قایم ہو، جو یورپ کے

نام نہاد سیاست داں اور مُدبّر اور مغرب کے نام نہاد تہذیب و تمدّن کے نام لیوا بنیِ نوعِ انسان کو مُلکوں، قوموں، اور رنگتوں میں تقسیم کر کے ایک کو دوسرے کے خلاف اُبھار رہے ہیں۔ وہ حقیقتاً ایک شیطانی کام کر رہے ہیں۔ اور اگر وہ کامیاب ہو گئے تو اسلام جو ساری مخلوق کو بلا جبر و اکراہ آپس میں مِل کر دُنیا میں امن و سلامتی کا دَور دَورہ قایم کرنے آیا ہے، سمجھو کہ وہ خدا نخواستہ ناکام و نامراد رہا۔ اسی لئے میں بار بار کہتا ہوں کہ خدا نے انسان کو اور شیطان نے قوم کو بنایا، یہی وہ فکرِ اسلامی ہے، جس کی نشر و تبلیغ ہر مسلمان کا فرض ہے۔ کہ دُنیا میں جنگ و جدل کا خاتمہ ہو، اور ساری خلقت بلا کسی تفریقِ حسب و نسب مرز و بوم و زبان و رنگ کے دینِ فطرت پر چلنے لگے اور سارے عالم میں نُورِ اسلام پھیل جائے، وہ نُور جس کی تعریف میں سورۃ النُّور میں اسلام کی درخت کو اس زیتون کے نام سے پُکارا گیا ہے، جو لا شرقیہ و لا غربیہ (نہ صرف مشرق نہ صرف مغربی) ہے، جس نبی کو رب المشرقین و رب المغربین نے رحمۃ اللعٰلمین بنا کر کافۃ الناس کے لئے بھیجا تھا، اسی کا دین انسانی سرشت ہے، فطرۃ اللّٰہ التی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللّٰہ۔ وہی حضرتِ آدم کا دین تھا، وہی ان کے بعد سب انبیاء کرام کا دین تھا۔ وہی رسولِ اکرم کا دین تھا، اور وہی آج ہر مو کا دین ہے، خواہ وہ کسی مسلم کے گھر پیدا ہوا ہو یا کافر کے۔

لوگوں نے دینِ فطرت کو چھوڑ کر قوموں اور مُلکوں کے جُدا گانہ دین بنائے ہیں۔ اور جُدا گانہ نام نہاد تہذیبیں گھڑ لی ہیں۔ اور کل حزب بما لدیھم فرحون ہر ایک اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے ہوئے اپنی ڈفلی پر اپنا ہی راگ گا رہا ہے۔ ہمیں عصرِ نو کی اس فکر جنسیت کو دُنیا سے مٹانا اور تمام دُنیا کو ایک کر کے جنگ و جدل کی جگہ اسلام اور سلامتی کو پھیلانا ہے۔ افسوس کہ میں اب تک بھی اس کام میں ناکام رہا اور بس

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز ٭ چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

لیکن اب تو اِسے گریباں سمجھ چکا ہوں، پھر دستِ وحشت کو کس طرح روک سکتا ہوں، کہ اِسے چاک نہ کرے۔ صیقلِ آئینہ کی کمی و بیشی خدا کے اختیار میں ہے۔

قارئینِ "ہمدرد" سے اب رخصت ہوتا ہوں، اُن سے التجا کرتا ہوں کہ میرے آئینۂ قلب کی صیقل اور دستِ وحشت کی کامیابی کے لئے دُعا فرمائیں کہ یہ گریباں ایک نہ ایک دن چاک ہو کر رہے۔ برما اور جنوبی افریقہ کی دعوتوں پر وہاں جا رہا ہوں۔ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس دعوت و تبلیغ میں میری کس حد تک امداد کریں گے۔ واپسی پر معلوم ہوگا کہ مزید صحرا نوردی اختیار کرنا چاہیئے یا غارِ حرا میں خلوت۔ جمہور کے اصلاح کی خواہش ہو تو جمہور میں ہر دل عزیزی حاصل کرنے کی کوشش سے بھلا کوئی کس طرح مستغنی ہو سکتا ہے۔ مگر باوجود اس کے آج بھی اِس فقیرِ بے نوا کا وہی قول ہے کہ ؎

مست ہوں جس مے سے میں اس مے کا پیمانہ نہیں
منّتِ ساقی نہیں، عوغائے مے خانہ نہیں

میرے لئے ساقئ کوثر کافی ہے۔ اسی سے اِلتجا ہے کہ ؎

جُود و سخائے ساقئ کوثر کی دُھوم ہے
ایک جام ہم کو بھی جو عطا ہو تو جانیئے

اب میں قارئینِ "ہمدرد" کو الوداع کہتا ہوں۔ میں نے جس کسی کا قصور کیا ہے، اس سے استدعا ہے کہ وہ مجھے معاف کرے، نہیں تو اسے اختیار ہے جو جی چاہے مجھے کہہ لے مگر میرے لئے دُعا ضرور کرے کہ خدا مجھے حق گوئی، حق نگاری، اور حق پرستی کی توفیق عطا فرمائے۔ اور میرے بے شمار گناہوں کو معاف فرمائے۔ افوض امری الی اللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

(ہمدرد دہلی ۱۲ اپریل ۱۹۲۹ء)

مولانا محمد علی جوہر

دُعا

مولانا محمد علی مرحوم کی بارگاہ خداوندی میں آخری دُعا[1]
کیا یہ دلسوز دعا مقبول ہوئی اور اس کے بعد مسجد اقصیٰ میں جگہ ملی

مولانا محمد علی مرحوم نے جب "ہمدرد" کو بند کیا اور وداعیہ مضمون لکھ کر یورپ روانہ ہوئے تو اس مضمون کو اس دعا پر ختم کیا۔ ناظرین دل تھام کر پڑھیں اور سوچیں کہ قلب و جگر کا خون قلم کے راستے کس خشوع و خضوع اور الحاج و زاری کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر چھڑکا گیا ہے۔ کیا عجب ہے کہ یہی صدا بارگاہ ایزدی میں مقبول ہوئی ہو۔ مرحوم نے تحریر فرمایا تھا کہ . . . "الامان" جلد ۱۲ نمبر ۱۳ فروری ۱۹۳۱ء

اے ربِ ذوالجلال !

اے وہ کہ تیری لطف فرمائی و کرم گستری کے بغیر ارادے ناکام، حوصلے پست، اور آرزوئیں صحرائے نامرادی میں تشنۂ تکمیل رہتی ہیں۔ تیرا ایک عاجز و خطا کار بندہ محمد علی تیرے حضور میں حاضر ہوا ہے کہ روح کی تڑپ اور دل کی بے چینی کے ساتھ دست دراز کرے اور تجھ سے اپنے اُن عزائم و افکار کی کامیابی اور اپنے اُن مقاصد و اغراض کی تکمیل کے لئے ہمنوائی پر توفیق کی درخواست کرے جو آج سے دس بارہ سال پہلے لے کر نکلا تھا۔ اور جو ایک

عرصہ سے میرے عمق قلب میں پرورش پا رہے تھے !

آج سے پہلے جب کبھی دین اقدس کی حمایت و پاسبانی اور ملک وملت کی خدمت گزاری کے لئے میں نے قدم اٹھایا تھا تو تیری ہی توفیق فرمائی کے بھروسے پر اور تیرے لطف وکرم گستری کے سہارے پر اٹھایا تھا اور آج بھی تیری اور صرف تیری مقدس ذات کا سہارا ہے اور اسی پر اعتماد وبھروسہ ہے۔ ؎ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ اور بھروسہ کرنے والوں کو صرف اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیئے کہ تیرے سوا اور کون سا دروازہ ہے۔ جس کو کوئی کھٹ کھٹائے اور کونسی چوکھٹ ہے جس پر جاکر سر رگڑے۔ ؟

ایک ہی در کا بھکاری ہوں مجھے
اک فقط تیرا سہارا چاہیئے

اے خدائے بزرگ وبرتر ،
اور اے عاجز نواز قدوس ،
تو ہر متمرد اور سرکش کی آخری جائے پناہ ہے !

مگر مجھ خطا کار و عصیاں شعار کا تو اوّل وآخر میں مامن وملجا صرف تیرا ہی وجود ہے۔ میں اگر کامیابی کے سروسامان اور کامگاری کے برگ وساز کے ساتھ ہی میدان عمل میں قدم دھرتا تب بھی میرے لئے تو اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ قدم اٹھانے سے پہلے تیری بارگاہ بندہ نواز میں حاضر ہوتا اور تیری چوکھٹ پر جبین ناز کو جھکاتا اور دل کے درد اور آنکھوں کی اشک باری کے ساتھ عرض کرتا۔

خسرو از تو پناہ می جوید
اے پناہ من و پناہ ہمہ

لیکن میں تو ایک گدائے بے نوا ہوں، ساز و سامان کی جگہ بے سروسامانی کے گرداب میں پھنسا ہوا ہوں۔ میرے پاس اگر کوئی پونجی ہے

تو صرف اس قدر کہ دل میں چند ارادے اور دماغ میں کچھ افکار ہیں جن کی تکمیل کا بھروسہ تری توفیق فرمائی ہے۔ اس کے سوا نہ کوئی ساز رکھتا ہوں نہ سامان۔

پھر اے عطا بار و خطا پوش خدائے رحیم !

میرے لئے یہ کیوں کر ممکن ہے کہ تجھ سے بے نیاز ہو جاوں جبکہ ہر نیازمند کا تو ہی مرکزِ ناز ہے اور تیری پیدا کی ہوئی کائنات میں وہ کون سی چھوٹی یا بڑی ہستی ہے کہ تجھ سے مستغنی ہو جب کہ نقطۂ استغنا صرف تیری ہی صاحب جود و کرم ذات ہے۔

جب تیرے پاک اور معصوم بندوں نے تجھ سے فریاد کی تو مجھ جیسے سراپا معصیت و پیکر خطا و نسیاں کے لئے اور کون سا ٹھکانا ہے اور بھلا کیوں کر تیری بارگاہ عزت سے اعراض کر سکتا ہوں۔ میں نے تو اسی وقت حضرت یوسف عَلَیہِ السَّلَام کی زبان میں تجھ سے دعا کی تھی جب کہ مجھے پہلی دفعہ ہم در و جدا کیا گیا اور دہلی سے مہرولی کی جانب جلاوطن کیا گیا تھا۔ اس وقت میری زبان سے فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا الخ نکلا تھا اور اسی دعا کا نتیجہ تھا کہ میرا دل ساڑھے چھ سال کی نظر بندی اور قید کے زمانے میں ایک لمحہ کے لئے مایوس نہ ہوا، مجھے تیری ذات پر بھروسہ تھا اور اس بات کا یقین کہ مجھے دنیا کی کوئی طاقت نقصان نہ پہنچا سکے گی۔ حضرتِ یوسف جن کو مجھ سے زیادہ قید کی سختیاں جھیلنی پڑی تھیں بالآخر وہی ایک دن اس ملک کے فرمانروا ہوئے۔ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ میرے سامنے کنعاں کے مقدس و محترم قیدی کی پوری تاریخ تھی اور جانتا تھا کہ تو قید و بند کی سختیوں کو بادشاہت کے جلال و جبروت سے بھی بدل سکتا ہے۔

اے ربِ قدیر و خدائے بصیر

تو دلوں کے پوشیدہ بھید، دل اور نیتوں کے اندرونی حسن و قبح سے واقف ہے، تو جانتا ہے کہ میرا ارادہ تیرے دین اقدس کی حفاظت تیرے رسول کی حمایت اور ہندوستان کی محکوم و مظلوم مخلوق کی خدمت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ تمام دنیائے اسلام اغیار کی محکومی سے آزاد ہو کر صرف تیری غلام بن جائے اور تیرے سوا اس کی گردن کسی دوسرے کے آگے نہ جھکے۔ اور سرزمین ہند کی بسنے والی مخلوق بھی اپنی قسمت کی آپ مالک بن جائے۔ اور یہ جو جانوروں کی مانند اجنبیوں کی غلامی کا جوا اپنی گردنوں پر ہم نے رکھ چھوڑا ہے اس کو سب متحد و متفق ہو کر اتار پھینکیں اور نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم انسانیت کے تمام افراد کو جبر و اکراہ سے نجات ملے اور وہی فطرت جس کے متعلق تو نے ارشاد فرمایا ہے فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا سب کو اسی دربار تک پہنچا دے جہاں سے آدم کو اِنِّي جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيفَةً کا خلعتِ فاخرہ عطا ہوا تھا۔ اور انسان اپنی حالت پر آجائے جس کی نسبت فرمایا ہے کہ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً

خداوند!

میں تیرا ایک حقیر و ذلیل بندہ ہوں اور صرف تیری نصرت فرمائی پر بھروسہ کر کے نو دس سال کے بعد پھر اپنی پرانی آرزوؤں کو لے کر اٹھا ہوں۔

کیا نہ ہو گی میری بھی حاجت روا؟
جس کا مولا قاضی الحاجات ہے

میری مدد فرما کہ میں اُن کی تکمیل کر سکوں اور جو ارادے اور خواہش میرے دل میں مدت سے پرورش پا رہی ہیں ان کی تکمیل کے لئے جن باتوں کی ضرورت ہے وہ عطا فرما۔ میرے دل و دماغ کو نور ہدایت سے منوّر کر دے کہ جس راستے پر میں گامزن ہوا ہوں اس کے نشیب و فراز کی دُوری دیکھ لوں۔

خداوند !

میں چاہتا ہوں کہ ہندوستان کی بسنے والی تیری مخلوق آپس میں متحد و متفق ہو جائے اور میں چاہتا ہوں کہ تیرے بندے آپس میں ایک دوسرے کا گلا کاٹنا چھوڑ دیں، مگر تیرے بندوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اس کے مخالف ہیں اَلٰہُ اَلعَالَمِین تو جانتا ہے کہ میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ میری بصیرت نے میری رہنمائی اسی طرف کی ہے کہ میرے وطن کی مظلومیت و محکومیت کے خاتمہ کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔ اگر میں غلطی میں مبتلا ہوں تو مجھ کو سیدھا راستہ دکھلا اور اگر میں نے صراط مستقیم اختیار کی ہے تو میرے قلم اور میری زبان میں اتنی قوت اور طاقت عطا فرما کہ اپنے گم کردہ راہ بھائیوں کو صحیح اور سیدھے راستہ کی طرف لا سکوں۔ ؎

جو ہر دہ صبر آپ ہی دے گا اگر ہیں
ہے اعتبار وعدۂ صبر آزمائے دوست

اس لئے اے میرے معبود !

اور اے کائنات عالم کے پروردگار !

میں تجھ سے دولت کے انبار اور زر و جواہر کے ڈھیر نہیں مانگتا میں تو تجھ سے استقامت کی درخواست کرتا ہوں، مجھے شیطانی طاقت کا گھمنڈ درکار نہیں ہے اور نہ ابلیسی قوتوں کا بل اپنے بازوؤں میں پیدا کرنا چاہتا ہوں، بلکہ ایک درد مند اور عاجز بندے کی طرح ظلم و ناانصافی کے خلاف حق و صداقت کے ہتیاروں سے جنگ کرنا چاہتا ہوں۔ ؎

مادریں در نہ پئے حشمت و جاہ آمدہ ایم
از بد حادثہ ایں جا بہ پناہ آمدہ ایم
آبروئے رود، اے ابر خطا پوش بباد
کہ بہ دیوان عمل نامہ سیاہ آمدہ ایم
یا چنیں گنج کہ شد خازن او روح امیں

بہ گدائی بہ در خانۂ شاہ آمدہ ایم
لنگر علم تو اے کشتیٔ توفیق کجاست
کہ دریں بحرِ کرم غرق فنا آمدہ ایم

خداوندا !

تو دل کے چھپے ہوئے بھیدوں اور پردہ ہائے قلب و رموز و اسرار کا علیم و خبیر ہے۔ اگر میرے دل میں کچھ کھوٹ ہو تو اپنے لطف و بندہ پروری سے اس کو دور کر اور میری نیت اور میرے قول اور میرے عمل کو صدق و صفا کے زیور سے آراستہ فرمادے کہ صداقت و راستی کا دریا میرے قلب کی گہرائیوں میں موجزن ہو جائے، کیونکہ تو حق پرستی کو دوست رکھتا اور صداقت و راستی کو پیار کرتا ہے۔

میرے مالک اور میرے آقا !

میرا ملک اور میری قوم جو ۲۲ کروڑ نفوس پر مشتمل ہے، خانہ جنگی میں مبتلا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تیری نصرت بخشی میرا ساتھ دے اور میں اپنی قوم اور اپنے ملک کو اس ہلاکت و بربادی کے دوزخ سے نکال کر صلح و آشتی کے بہشت زار حیات میں لاکر کھڑا کردوں اور ہندوستان جو دو سال سے آپس کے لڑائی جھگڑوں سے جہنم کدۂ فساد بنا ہوا ہے، وہ پھر جنت نشان بن جائے۔ گو حالت نہایت یاس افزا اور مایوس کن ہے۔ مگر اے وہ ذات پاک کہ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ تیری شان ہے۔ میں مایوس نہیں ہوں اور کیونکر مایوس ہو جاؤں جب کہ مژدہ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ اور فرمان لَا تَيْأَسُوا مِن رَّوْحِ اللَّهِ موجود ہے پس، اے مایوسی کو کامیابی، نا امیدوں کو امید اور ناکامی و نامرادی کو کامیابی و کامرانی سے بدل دینے والے قادر و ذُو الْجَلَالِ، ہم پر رحم کر۔ تو نے ابراہیم کو نمرود سے نجات دلائی، موسیٰ کو فرعون سے چھٹکارا دلایا، رام کو راون پر

فتح دی اور کرشن کو کنس پر غالب کیا، ہم بھی مظلوم ہیں اور محکوم، ہم کو بھی غلامی کی زنجیروں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے پاک اور روحانی طاقت عطا فرما۔ یعنی ہمارے قلوب کو سمندروں کا جوش و خروش، پہاڑوں کی سی مضبوطی اور عزم و وقار اور زمین کی سی عجز و فتادگی اور تحمل و برداشت عطا فرما تاکہ آزادی کی منزل مقصود پر پہنچنے کے لئے ہم کسی کوشش سے دریغ نہ کریں نہ کسی ناکامی و نامرادی سے گھبرائیں، اور انھیں کی تقلید کریں جن کے بارے میں تو نے فرمایا۔

فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ [۱]

فٹ نوٹ: [۱] یہ آخری تحریری دعا ہے۔ یوں تو وہ نماز میں دعا مانگتے ہی ہوں گے نیز اس دعا کے بعد اُن کی مشہور دعا وہ بھی پیش رکھنی چاہیئے جو انھوں نے مکۂ معظمہ کی زیارت کے موقع پر غلاف خانۂ کعبہ پکڑ کر فرمائی تھی۔

۲۔ ہندی الفاظ کے ساتھ واؤ مربوط اب نہیں لکھا جاتا لیکن رئیس التحریر کے زمانے میں چنداں مضائقہ نہیں سمجھا جاتا تھا بشرطیکہ ارتباط و عطف گراں نہ گزرے۔

۳۔ اس آیت حکیم کا ترجمہ یہ ہے:۔ اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنیوالے تو میرا کارساز ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، مجھ کو پوری فرمانبرداری کی حالت میں دنیا سے اٹھا لے اور مجھ کو خاص نیک بندوں میں شامل کر لے۔

۴۔ اس آیت کریمہ کا ترجمہ یہ ہے:۔ اور ہم نے ایسے (عجیب طور پر یوسف (علیہ السّلام) کو با اختیار بنا دیا کہ اس میں جہاں چاہیں رہیں سہیں، ہم جسپر چاہیں اپنی عنایت ارزاں کر دیں اور ہم نیکی کرنیوالوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

۵۔ آیت کریمہ کا ترجمہ یہ ہے:۔ اور جس وقت ارشاد فرمایا، آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا کہ ضرور میں بناؤں گا زمین پر ایک نائب۔

۶۔ تمام لوگ، امتِ واحد ہیں۔

(الامان رئیس الاحرار نمبر ۲۵ جنوری ۱۹۴۱ء)

مولانا محمد علی جوہر

جیوری سے خطاب

(مقدمۂ کراچی میں جیوری کے سامنے رئیس الاحرار مولانا محمد علی نے جو بیان دیا تھا، اُس کا تلخیص و ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ جگہ کی قلت مانع ہے۔ مزہ تو پورا بیان پڑھنے میں ہے۔

مولانا محمد علی پر تعزیراتِ ہند کی دفعات ۱۰۹، ۱۱۷، ۱۲۰ (ب) ۱۳۱، ۵۰۵، کے تحت مقدمہ چلایا گیا تھا، حالانکہ کرمنل پروسیجر کوڈ دفعہ ۲۳۴ کے تحت یہ تمام دفعات سے متعلقہ الزامات ایک ساتھ نہیں لگائے جا سکتے تھے۔

مولانا محمد علی کا یہ بیان ادیبانہ شان، زورِ خطابت، ترقی یافتہ شعور، مزاح، طنز اور محاسن زبان کا ایک نادر نمونہ ہے۔

"حضرات جیوری! مجھے اس مقدمہ سے بری ہونے اور سزا سے بچنے کی ذرا فکر نہیں۔ مجھے اس کی بھی فکر نہیں ہے کہ اپنی کوئی صفائی پیش کروں۔ میں کسی قسم کی صفائی پیش نہیں کرتا۔ گو کہ مجھے قانونِ اسلام کی تشریح محض اس لئے کرنی پڑی کہ آپ کو یہ سمجھا دوں کہ اس مسئلہ کا عدالت میں ہمارے طرزِ عمل سے کیا تعلق ہے۔ میں نے گواہانِ ثبوت سے جرح کی، نہ اپنی صفائی میں کوئی شہادت پیش کی، مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ جو میرے ہم وطن ہیں اور اس وقت حکومت کے ساتھ شریکِ کار ہیں، ایک بات پر غور کر لیں، دُنیا کی تاریخ میں آپ دیکھیں گے کہ بہت سے مشہور سیاسی مقدمات چلے ہیں، جن میں بہت سے بڑے بڑے لوگ مجرم قرار دیئے گئے ہیں، خود فرانس کی تاریخ میں غریب جان اف آرک کو جادوگرنی سمجھ کر مارا گیا تھا۔ مگر نتیجہ کیا ہوا۔؟ فرانس میں میرے ہوٹل کے سامنے اس کا سنہری مجسمہ نصب تھا اور میں جس زمانہ میں وہاں تھا، اس

اسی زمانہ میں کیتھولک کلیسا کے اسقف اور پادریوں نے اس مجسمہ کو برکت دی، مگر ان لوگوں کے خلاف کیا کیا گیا، جنہوں نے جون آف آرک کو زندہ جلایا تھا؟ خود برطانوی فوج نے بھی فرانسیسیوں کے ساتھ شریک ہو کر اس کے نام پر خراجِ تحسین اور آفریں ادا کیا اور اس کے مجسمہ پر پھول چڑھائے۔ ایک ایسے ہی موقع پر میں خود موجود تھا۔ شاہ جارج سوم کے زمانہ میں جارج واشنگٹن بھی ایک باغی سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا۔ مگر آج اُس کی نسبت برطانوی حکومت کیا کہتی ہے! آج تو اُس کو دُنیا کا سب سے بڑا محبِّ وطن کہا جاتا ہے۔

میں خاص طور پر اُن صاحب سے خطاب کرنا چاہتا ہوں، جو جماعتِ جیوری میں تنہا ایک ہی انگریز ہیں۔ انگریزوں کا یہ فرض نہیں ہے کہ اپنے اہلِ مُلک کے اکثریت کے قدم بقدم چلیں۔ خصوصاً باطل پرستی اور نااتفاقی میں۔ یقین کیجئے کہ انگلستان کی تمام تاریخ میں اکثر کم تعداد جماعتیں برسرِ حق رہی ہیں۔ ان ہی جماعتوں نے ہمیشہ عظیم الشان اور نیک تحریکوں کو شروع کیا ہے۔ دُنیا کی تاریخ میں کوئی عظیم الشان تحریک اکثریت کی طرف سے شروع نہیں ہوئی۔ پائیلیٹ[1] سولی پر نہیں چڑھایا گیا تھا بلکہ مسیح مصلوب ہوئے تھے۔ اُن پر خدا کی رحمت اور برکت ہو، جیوا پائیلیٹ خود تو جج تھا، جس نے مسیح کے خلاف فیصلہ دیا تھا۔ مگر آج اصل فیصلہ کون دینے والا ہے۔ اور آج کے بعد کون دے گا؟ روزِ حشر خدا پائیلیٹ سے متعلق اپنا فیصلہ دے گا، جس کو معلوم نہ تھا کہ حق کیا ہے۔ مگر آج پائیلیٹ کہاں ہے۔ اس مسیح کو مصلوب کرنے والے جج کو کون جانتا ہے۔ محض مسیح کے مصلوب کرنے کی وجہ سے ان کا نام مشہور ہے۔ لیکن کروڑوں انسان کے لئے مسیح کا نام مصدرِ شقاوت ہے۔

میری کیا حقیقت ہے کہ مجھ جیسا ناچیز مسیح سے اپنی حالت کا موازنہ کرنے کی جرأت

---

[1] Pilate

کرے' میں تو اتنی حیثیت بھی نہیں رکھتا کہ مسیح کے نیچے کی خاک بھی چھو سکوں۔ مگر جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے:

"یہ ضروری نہیں کہ کمزوری ہمیشہ باطل پرستی سے تعبیر کی جائے۔ حق تو حق ہے۔ کم ہو یا زیادہ' (جس حد تک ہو) وہ حق جس کو خدا نے اپنی گرجتی ہوئی آواز سے فطرتِ انسانی تک پہنچا دیا۔ وہ حق جس کو میری رُوح میرے کان میں کہہ رہی ہے۔"[۱]

اس حالت میں جب کہ برطانوی توپیں گرج رہی تھیں' ایک ناچیز انسان کی رُوح نے اس کے کان میں اس حقانیت کا ایک جُزوِ قلیل کہہ دیا۔ جو خدا کی غیر فانی ہمیشہ قائم رہنے والی اور رُوح کو سہارا دینے والی حقانیت ہے۔ اور وہ یہ کہ ناچیز انسان صریح قانونِ الٰہی کے خلاف ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر مسلمانوں کو مسلمانوں کے ہاتھ ذبح ہوتے نہ دیکھے۔ بلکہ اس عمل کے خلاف تبلیغ و تلقین کرے۔ اور کلمۂ حق کو پھیلائے' اس طرح پھیلائے کہ نہ کسی دوسرے انسان کا خوف اس پر طاری ہو' نہ وہ دینوی نتائج سے متاثر ہو۔

(اس کے بعد حضرت موسیٰ اور قوم بنی اسرائیل کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا:)

قرآن میں مذکور ہے کہ جب موسیٰ (ان پر خدا کی رحمت و برکت ہو) بنی اسرائیل کو مصر سے بخیر و عافیت نکال لائے اور وہ فرعون کے ظلم سے بچائے گئے' تو اُن سے کہا گیا کہ اب ارضِ موعود کی طرف چلو' مگر اُنہوں نے کہا کہ وہاں تو دیو بستے ہیں۔ "ان فیھا قوم جبارین" "جب تک دیو وہاں ہیں' ہم تو اس سرزمین پر داخل نہ

Weekness never need be falseness [۱]
Truth is Truth in each degree
Thunder pealed by God to Nature,
Whispered by my soul to me.

ہو سکیں گے۔[1]

حضرت یہ مثال وہ ہے، جس پر آپ نے ارضِ مقدس کے متعلق عمل کرنے کے بجائے مجھے حکم دیا ہے کہ اس سے احتراز کروں، میں اس قانون کو قبول نہیں کر سکتا، میں یہ نہیں کر سکتا کہ چونکہ اس ارضِ مقدس پر طاقت ور لوگ حکمراں ہیں، اگرچہ وہ دیو نہیں، اس لئے میں کہہ دوں کہ تم اور تمہارا خدا جائے اور لڑے، ہم یہاں آرام کرتے ہیں۔ اس موقع پر میرا یہ کام نہیں ہے کہ میں اس قانون اور اس مثال کے مناسب یا نامناسب ہونے پر بحث کروں۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، قرآن میرا قانون ہے، چاہے ارضِ مقدس پر دیو رہتے ہوں، یا کوئی اور، میں تو جب میرا خدا حکم دے گا آؤں گا اور آرام سے بیٹھا نہ رہوں گا۔ خدا سے یہ کہوں گا کہ خدا تو خود جا اور دیوں سے لڑ، مجھے اگر پھانسی پر بھی چڑھا دیا جائے (اس لئے کہ دفعہ ۲۰ الف اور ب نہیں بلکہ مجھ پر دفعہ ۱۲۱ العبق بادشاہ کے خلاف بغاوت کا جرم عائد ہے) تب بھی حضرات میں تو یہی کہوں گا کہ میرا قانون قرآن ہے اور یہی حق ہے اور مجھے اُمید ہے کہ میری لاش بھی جب پھانسی پر لٹکی ہوگی تو وہ بھی یہ ہی پکارے گی۔ پس حضرات مجھے سزائے حبسِ دوام بعبور دریائے شور سے بچانے کا تو خیال بھی نہ کیجئے۔ لیکن اگر آپ خدا رکھتے ہیں، اور اگر آپ رُوح رکھتے ہیں، جس کو عذاب سے بچانا ہے تو اپنے ضمیر کے مُطابق فیصلہ دیجئے۔ آپ کو اس امر پر غور کرنا نہیں ہے کہ آپ کسی کمپنی کے مُلازم ہیں، یونانی کمپنی ریلے براورسس[2] کی یا فورس اور کیمپل یا محاصل خانہ کے مُلازم ہیں۔ آپ کو تو صرف یہ سوچنا ہے کہ آپ خدا کے غلام اور حکم بردار ہیں۔

حضرات! بس یہی ایک اہم مسئلہ ہے۔ اپنے ضمیر کے مطابق فیصلہ دیجئے، مجھے

---

[1] وان نہ تخملھا حتی یخرجو منھا فان یخرجو منھا انا داخلون ـــــ الخ

بچانے کی نہیں، بلکہ خود اپنے کو (عذاب آخرت سے) بچانے کے لئے جس وقت جج نے میری تقریر پر اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا کہ "میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا" اور چاہا تھا کہ میں تقریر ختم کر دوں۔ تو میں نے ان کو جواب دیا تھا کہ "مجھے ہاتھ کے ہاتھ پھانسی پر چڑھا کر یہیں تماشے کو ختم کیوں نہیں کر دیتے۔ تب اُس نے مُسکرا کر کہا تھا کہ "یہ معاملہ محض میرے آپ کے درمیان نہیں ہے بلکہ میرے اور پبلک کے درمیان بھی ہے"؛ جس پر میں نے کہا تھا کہ پبلک تو اپنا فیصلہ دے چکی۔ اس مکان کے اندر بھی اور سڑکوں پر بھی۔ جہاں ہزاروں آدمی جمع ہوتے ہیں۔ اور ہمیں عدالت میں آتے جاتے دیکھ کر نعرے لگاتے ہیں۔ جہاں تھوڑی عورتیں بھی پردے سے باہر نکل آتی ہیں۔ (جیسا کہ میری ماں نے اس مقدمہ کے شروع ہوتے ہی اپنا پردہ ختم کر دیا) اور ہماری بلائیں لیتی ہیں۔ پس حضرات! میری صفائی، میرے خدا کے سامنے اور میرے ہم وطنوں کے سامنے پیش ہو گی۔ ہم آج عدالت کے سامنے قیدیوں اور مُلزموں کی حیثیت سے کھڑے کئے گئے ہیں۔ مگر جس دن خدا کی مسند عدالت کے سامنے جج اور جیوری مُلزم اور اُن کے شرکار وکیل سرکار اور اُن کے اسسٹنٹ سب لوگ اور خود بادشاہ کھڑے ہوں گے۔ اس وقت خدا سوال کرے گا "آج کے دن یہ ملک کس کا ہے[1]"، تو آپ کا جواب کیا ہو گا؟ آپ کہیں گے کہ اے خدا یہ ملک میرا ہے۔

آپ کہتے ہیں کہ "میری سلطنت جو آنے والی ہے" مگر حضرات! خدا کا تسلط تو ہو چکا۔ خدا اور اس کی سلطنت آ گئی۔ آج بھی یہاں اس وقت خدا کی سلطنت موجود ہے۔ یہ شاہ جارج کی سلطنت نہیں ہے۔ خدا کی سلطنت ہے۔ اور اسی بُنیاد پر آپ فیصلہ دیں۔ اور اسی بُنیاد پر مجھے عمل کرنا ہے۔ اسی لئے تو میں کہتا ہوں، کہ میں صرف اس حد تک شاہ جارج کے قانون کی تعمیل کروں گا، جہاں تک کہ وہ مجھے خدا کے قانون کے خلاف عمل کرنے پر مجبور نہ کریں میرے دل میں ذاتی طور پر بادشاہ کے متعلق کوئی عناد نہیں ہے۔ مجھے جج کے ساتھ بھی

۱؎ لمن الملک الیوم۔

عناد نہیں ہے۔ نہ گورنمنٹ کے خلاف، حضرات ہم سب کو مفادِ عامہ کے مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر کام کرنا چاہیئے، نہ کہ ذاتی بغض و عناد کی بنا پر ۔۔۔ میں ذاتی عناد کے باعث تو ایک مچھر کو بھی نہیں مار سکتا۔ لیکن اپنے خدا کے واسطے میں سب کو قتل کر دوں گا۔ میں کسی کو جان کی اماں نہ دوں گا۔ میں اپنے بھائی کو ذبح کر ڈالوں گا، اپنی پیاری بوڑھی ماں کو، اپنی بیوی کو، اپنے بچوں کو سب کو خدا کی راہ میں ذبح کر دوں گا۔ خدا میری مدد کرے۔

(جس وقت مولانا نے آخری فقرات ادا فرمائے، اُن کی آواز پڑ گئی تھی، آنسوؤں کے قطرے رُخساروں پر ڈھلک رہے تھے۔ اور آخر بالکل بے اختیار ہو کر بیٹھ گئے۔) (الامان ۱۹ر فروری ۱۹۳۱ء)

رحلتِ رئیس الاحرار

ضیاء بدایونی

صد حیف ضیاء وہ سرفروش و سرِ دار — خود جی سے گیا وطن کی خاطر ناچار
اس سانحۂ مرگِ ناگہاں کی تاریخ — لکھ دیجیے رحلتِ رئیس الاحرار

آخری شعلۂ تقریر

(مولانا محمدؔ علی نے ۱۹ر نومبر ۱۹۳۰ء کو بعذرِ علالت بیٹھے بیٹھے گول میز کانفرنس لندن میں تقریر کی۔)

جنابِ صدر! کیا میں یہ غیر مناسب رعایت، پر عمل کرتا ہوا، بیٹھا ہی رہوں میرے دوست مونجے نے اپنی سرگذشت بیان کردی کہ کس طرح انھیں وطن کا غدّار کہا گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں بھی ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ جب ہم ہندوستان سے روانہ ہوئے تھے، تو تجویز یہ ہوئی تھی کہ سیاہ ماتمی جھنڈوں کے ساتھ ہمیں "خیرباد" کہی جائے، اور جن لوگوں کے ساتھ ہم نے مُدّت العمر کام کیا تھا، ان کی دُعا یہ تھی کہ "سفینۂ وائسرائے ہند" سمندروں کی لہروں سے عہدہ برآنہ ہوسکے یہاں تک کہ جب میں اس ملک میں پہنچا، تو یہاں کے ایک اخبار "ڈیلی ہیرلڈ" نے (جس کے مالی استحکام میں میں نے بھی حصّہ لیا تھا) اور مجھے خوشی ہے کہ آج اس کی اشاعت دس لاکھ تک پہنچی ہوئی ہے) میری تصویر شائع کی، اور میری نسبت لکھا کہ میں نے اپنا عقیدہ تبدیل کرلیا ہے۔ یعنی میں حُبِّ وطن کو چھوڑکر غدّارِ وطن بن گیا ہوں۔

ما ہمائیم کہ بودیم

جس قدامت پرست لارڈ نے کل صفائی اور نیک نیتی کے ساتھ کچھ کہہ دیا تھا، اس کے علاوہ بھی پارلیمنٹ میں ایک بڑے قدامت پسند بزرگ موجود ہیں، یعنی سر چارلس اومن جو آکسفورڈ میں میرے اُستاد اور اتالیق تھے۔ میں ان کی تاریخ سے ایک مختصر فقرہ پیش

کرتا ہوں، یہی فقرہ ان سوالات میں سے ایک تھا جو انڈین سول سروس کے امتحان میں ہم سے کئے گئے تھے۔ میں بھی اس امتحان میں شریک ہوا تھا، لیکن ناکام رہا۔ چارلس لکھتے ہیں کہ "عرب ہی دُنیا میں ایک ایسی قوم ہے، جس کے عقیدہ کو تبدیل کرنا غیر ممکن ہے" میں یہاں کے سفید فام افراد اور ڈاکٹر مونجے کی طرح یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میری رگوں میں آریائی خون دوڑ رہا ہے۔ میری رگوں میں وہی خون ہے، جس سے شاید لارڈ ریڈنگ کی رگیں معمور ہیں، جنہوں نے مجھے قید کیا تھا، میں سامی نسل سے تعلق رکھتا ہوں اور اگر لارڈ ریڈنگ نے صیہونیت سے برگشتگی اختیار نہیں کی (قہقہہ) تو میں نے بھی اسلام کو ترک نہیں کیا۔ میں جہاں پہلے تھا، اس وقت تک ہوں۔ اپنی جماعت کا میں ہی ایک فرد ہوں جسے ہزایکسیلنسی وائسرائے نے یا ملک معظّم کی حکومت نے یا کسی دوسری ہیئت حاکمہ نے جس کی ہدایت کے ماتحت ان عجیب وغریب مندوبین کا تقرر عمل میں آیا ہے، منتخب کرکے یہاں بھیجا ہے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ ہم کس کے مندوب ہیں۔ (قہقہہ) میں کسی جماعت کی نمائندگی کا دعویدار نہیں۔ لیکن میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آپ صبر وسکون کے ساتھ میری ساری باتیں سُن لیں، تو میرے دعوے کو حق بجانب قرار دیں گے کہ میں اپنی ذات کے متعلق کوئی غلط بیانی نہیں کروں گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اتنا کہہ دینا کافی ہے۔ سیاحت میں لوگ اپنی ذات کے متعلق بھی غلط بیانیاں کرنے میں اکثر وبیشتر متامل نہیں ہوتے

چھوٹے دل اور بڑی سلطنتیں

لارڈ پیل نے جو کچھ کہا تھا، اس کے جواب میں صرف ایک انگریز شاعر کے حوالے پر اکتفا کروں گا۔ جیسا کہ میں نے برآمدے میں سے آتے ہوئے کہا تھا کہ جناب والا! آپ قدامت پسند ہیں اور قدامت پسند رہیں گے۔ ٹینی سن نے قدامت پسند کی تعریف یہ کی ہے کہ "بہترین قدامت پسند وہ ہے، جو خشک شاخ کو کاٹ ڈالتا ہے۔"

لارڈ پیل نے خلوص وصاف گوئی کے ساتھ جن خیالات کا اظہار کیا، وہ سوکھی ہوئی شاخ کے مانند ہیں، جسے کاٹ ڈالنا چاہیئے (قہقہہ) میری طرف سے لارڈ پیل کی تقریر کا

یہی جواب کافی ہے۔ باقی رہے دوسرے قدامت پسند یعنی ہمارے شہزادے مثلاً والی ریاست ہز ہائی نس مہاراجہ صاحب ریوا، تو میں سمجھتا ہوں کہ انھیں واقعی قدامت پسند ماننا چاہیئے یا نہیں (قہقہہ) اگر وہ برک کو قدامت پسند سمجھتے ہیں اور اپنی تقریر کے آخر میں اس کی تقریر کا حوالہ دینا پسند کرتے ہیں تو میں کہوں گا کہ قدامت پسند رہیئے اور قدامت پسندی کا دامن نہ چھوڑیئے۔ ہز ہائی نس نے برک کے حوالہ سے کہا تھا کہ "چھوٹے دلوں اور بڑی سلطنتوں کا کوئی ساتھ نہیں"۔ اگر سلطنتِ برطانیہ (اسے سلطنت، یا مختلف اقوام کی دولتِ متحدہ یا جو کچھ آپ کے جی میں آئے کہیئے) برقرار رہنا چاہتی ہے تو چھوٹے دلوں کو جو مدّتِ مدید سے نظر آرہے ہیں اور جن کی آواز برابر سُنائی دے رہی ہے، لازماً غالب ہوجانا چاہیئے (تالیاں) اگر آپ برک کے بتائے ہوئے راستہ پر چلتے تو امریکہ آپ کے ہاتھ سے نہ چھٹتا، آج آپ کو جنگی جہازوں کی تعمیر کا شور سُنائی نہ دیتا، قرضے ادا نہ کرنے پڑتے، یہ پریشانیاں لاحق نہ ہوتیں، تخفیفِ اسلحہ کی کانفرنس کے لئے راستہ صاف کرنے کی غرض سے آپ کو بار بار جنیوا جانا نہ پڑتا، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ تیاریاں کب تک جاری رہیں گی (قہقہہ) یہ ساری مصیبتیں آپ کو اس لئے پیش آئیں، کہ آپ نے اپنے سب سے بڑے سیاست داں اور سب سے بڑے مُدبّر کے قول کو پسِ پشت ڈال دیا۔ یہ وہی شخص تھا جسے دارالعوام میں "کھانے کی گھنٹی" کہا جاتا تھا۔ کیوں کہ جب برک تقریر کے لئے اُٹھتا تھا تو آپ سب لوگ کھانے کے کمرے میں چلے جاتے تھے۔ برک جیسے آدمیوں کے ساتھ آج بھی آپ کا سلوک ویسا ہی ہے اور اسی لئے میں دوبارہ برک کے الفاظ کا حوالہ دیتا ہوا کہتا ہوں کہ تجاویز کی ضرورت نہیں۔ آدمیوں کی ضرورت ہے۔

میں اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ آپ ہمارے لئے کون سا دستور اساس تیار کرتے لیکن کاش آپ کے پاس انگلستان میں ایک آدمی بھی ہو جو درحقیقت انسان ہو اور جس کے متعلق شاعر نے کہا ہے:

> اے خدا ایسا انسان دے، جو دل و دماغ اور ہاتھ رکھتا ہو، وہ اُن بعض بڑے آدمیوں کی طرح ہو جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گذر چکے ہیں، ایک شور و غوغا

سے لبریز سرزمین میں ایک طاقتور آدمی کی ضرورت ہے۔ وہ خواہ امیر ہو، خود مختار ہو، جمہوریت پسند ہو، کچھ بھی ہو، مگر ایسا ہونا چاہئے جو حکومت کر سکے اور جھوٹ بولنے کی جُرأت نہ کرے۔"

مجھے اُمید ہے کہ میرے قدیم دوست مسٹر میکڈانلڈ کم از کم اس حکمراں آدمی کو ثابت کر دکھائیں گے۔ اور وہ اپنی جماعت، اپنے ضمیر، اپنی مردہ بیوی کی رُوح اور اپنے زندہ ملک سے جھوٹ بولنے کی جُرأت نہیں کریں گے۔ اور اگر آپ لوگ جن کا تعلق تمام پارٹیوں سے ہے، اس کی مدد کریں گے جو آپ کو کرنی چاہئے۔ تو مجھے یقین ہے کہ آپ تاریخ میں ایک باب کا اضافہ کریں گے۔

ملک معظّم بھی اِنسان ہیں

میں ایک ری پبلکین (جمہوریت پسند) ہونے کے باوجود اس امر کا اقرار کرتا ہوں کہ جس قدر میں اپنے پُرانے دوست مسٹر میکڈانلڈ پر بھروسہ کرتا ہوں، اس سے زیادہ مجھے اُس آدمی پر بھروسہ ہے (میں اسے انسان ہی کہوں گا، کیوں کہ آخر وہ انسان ہے) جس نے دارالامراء کی گیلری میں اس کانفرنس کا افتتاح کیا اور جس کا نام جارج پنجم ہے۔ خواہ آپ اُسے ہز مجیسٹی کہیں یا جو کچھ بھی کہیں، وہ ایک انسان ہے (نعرہ ہائے مسرت) اپنے گذشتہ یا موجودہ وزراء میں کسی کو لیجئے، لیکن وہ انسان اس کے مقابلہ میں ہندوستان کو بہتر جانتا ہے، (نعرہ ہائے تحسین) میری نگاہیں اب اس انسان کی طرف لگی ہوئی ہیں کہ وہ خدا کی تینتیس کروڑ مخلوق کے ساتھ انصاف کرے جو دُنیا کی کُل آبادی کا پانچواں حصّہ ہے۔ ہندوستان کے والیان ریاست کی حیرت انگیز حُبِّ وطن کو دیکھ کر جو یہاں ایک قطار میں بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں، اور جو ہندوستان کا قدامت پسند عنصر ہیں، میرا ایمان زیادہ مُستحکم ہو گیا ہے (نعرۂ تحسین) لارڈ پیل اور لارڈ ریڈنگ کے لئے یہ نئی بات ہوگی مگر میرے لئے نئی بات نہیں ہے۔

ریاستوں سے تعلقات

میری شخصیت اس جگہ ایک عدیم النظیر حقیقت رکھتی ہے، میں برطانوی رعایا ہوں، مگر مجھے انڈین سول سروس کے امتحان سے پہلے اس بنا پر خارج کر دیا گیا تھا کہ میں برطانی پیدائشی رعایا نہیں ہوں، لیکن مجھے عارضی طور پر امتحان میں داخل کر لیا گیا۔ تا آنکہ یہاں کے حکّام کو میری والدہ کی طرف سے شہادت مل گئی، لیکن اس کے ساتھ میں ایک ہندوستانی ریاست کی رعایا ہوں اور اس لحاظ سے جیسا میں بیان کر چکا ہوں، اس کانفرنس میں ایک بے مثل شخص ہوں، میں ایک ریاست میں پیدا ہوا، اسی ریاست میں مُلازمت کے فرائض انجام دیئے، میں ریاست بڑودا میں بھی مُلازم رہا ہوں، میرے آقا گائیکواڑ بڑودہ اس وقت یہاں تشریف رکھتے ہیں۔ میں نے سات سال تک ان کا نمک کھایا ہے۔ دو سال ہوئے میں اس قدر سخت بیمار ہو گیا کہ بچنے کی کوئی اُمید نہ تھی تو اس وقت ہز ہائینس مہاراجہ الور نے اپنا خاص ڈاکٹر اپنے خرچ پر میرے علاج کے لئے بھیجا، جب پھر شملہ میں میری حالت نازک ہو گئی تو ہندوستان کے ایک والیٔ ریاست نے جن کو میں ایک مرتبہ پرائیوٹ اتالیق کی حیثیت سے پڑھانے والا تھا، ایسی مہمان نوازی کا ثبوت دیا جس کا حق ابھی اہلِ برطانیہ ادا نہیں کر رہے ہیں۔ ہز ہائینس نواب صاحب بھوپال نے اپنے مہمان خانہ کو میری خاطر شفاخانہ میں منتقل کر دیا۔ اگر انگریز بھی ہر شفاخانہ میں جو سلطنتِ برطانیہ میں موجود ہے، مجھے ایک آزاد مریض تسلیم کر لیں، تو میں سمجھوں گا کہ انہوں نے مہمان نوازی کا پُورا حق ادا کر دیا (قہقہہ)۔

سراپا امراض

جب مجھے شملہ کے شفاخانے میں بھیجا گیا، تو میں ایک طرف ایک یُورپین خاتون اور دوسری طرف ایک فوجی افسر کے درمیان حائل ہو گیا، جن کی شادی عنقریب ہونے

والی تھی، میری جگہ (بستر) ان دونوں کے درمیان تھی۔ دونوں بیمار تھے، خاتون نے جب ایک عجیب ہیئت کے ہندوستانی کو یورپین علاقے میں آتے دیکھا تو اس نے ہمارے ڈاکٹر سے دریافت کیا کہ بڑے میاں کو کس مرض کی شکایت ہے۔ ڈاکٹر نے جواب دیا، یہ نہ پوچھو کہ اس کو کیا شکایت ہے، بلکہ یہ پوچھو کہ اسے کون سے مرض کی شکایت نہیں ہے؟ (قہقہہ) میری یہ کیفیت ہے کہ قلب کی حالت درست نہیں، بینائی میں فرق آگیا ہے۔ پاؤں متورم ہیں۔ ذیابطیس کا عارضہ ہے، بیماریوں کی اس طویل فہرست سے جو آپ کے سامنے میں نے پیش کی ہے، میرے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے، کہ کہیں کرنل گڈنی ایک طبیب کی حیثیت سے تشریح امراض کے معاملہ میں مجھے اپنا رقیب نہ سمجھ لیں، (قہقہہ) میں کہتا ہوں، کہ جس آدمی کے حواس بجا ہیں، وہ ان بیماریوں کے ساتھ سات میل کا سفر بھی طے نہ کر سکتا، لیکن پھر بھی میں خشکی اور سمندر کے سات ہزار میل کا سفر طے کر کے یہاں پہنچ گیا ہوں۔ کیونکہ جہاں اسلام اور ہندوستان کا معاملہ آجاتا ہے، وہاں میری حالت دیوانوں کی سی ہو جاتی ہے۔

ڈیلی" ہیرلڈ" نے کہا ہے کہ میں نے اپنا سیاسی عقیدہ تبدیل کر لیا ہے، میں پہلے گورنمنٹ کا باغی تھا، لیکن اب اپنے ملک کا غدار ہوں۔ اور اب میں گورنمنٹ کے ساتھ مل کر کام کر رہا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ میں شیطان کے ساتھ بھی مل کر کام کر سکتا ہوں، بشرطیکہ خدا کے راستے میں کام کرتا ہو۔

آزادی یا موت

مجھے اُمید ہے کہ آپ مجھے اس طویل تمہید کے لئے جس میں میں نے اپنی بیماری اور عوارض اور دیگر باتوں کا ذکر کیا ہے، معاف فرمائیں گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج جس ایک مقصد کے لئے میں یہاں آیا ہوں، وہ یہی ہے کہ میں اپنے مُلک کو صرف اسی حالت میں واپس جاؤں جب کہ آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں ہو، میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا۔ میں ایک غیر ملک میں جب تک وہ آزاد ملک ہے، مرنے

کو ترجیح دوں گا۔ اور اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے تو پھر آپ کو یہاں مجھے قبر کے لئے جگہ دینی پڑے گی (نعرۂ تحسین)

قدامت پسندوں کا تذکرہ

میں نے ابتدا کنسرویٹو اصحاب کے شکریہ سے کی ہے، جب میں اس ڈنر میں شریک ہوا جو گورنمنٹ کی مہمان نوازی کے صدقے میں ہمارے لئے مہیا کیا گیا تھا، جب کہ میں درحقیقت بہت بیمار تھا۔ اور مجھے بستر پر پڑا رہنا چاہئے تھا۔ تو میں اس انتظار میں تھا کہ مجھے چیری کی لکڑی کا پائپ نظر آئے، (جسے ہر وقت مسٹر بالڈون پیتے رہتے تھے) اور خدا کا شکر ہے کہ وہ پائپ نظر آ گیا۔ میں مسٹر بالڈون کے پاس گیا اور ان سے کہا "آپ نے دو طریقوں سے تاریخ کو روشن کیا ہے، اگرچہ آپ ایک کنسرویٹو ہیں، اور آپ کا تعلق ایک ایسی پارٹی سے ہے جو نام نہاد احدی امرا کی ہے۔ آپ نے کم از کم یہ قاعدہ قائم کرکے ایک انسانی فرض ادا کیا ہے، کہ جہاں ڈنر کے بعد صرف کرونا (اعلیٰ تمباکو) پیا جا سکتا تھا، وہاں ایک بھلا آدمی اپنے چیری کے پائپ میں ادنیٰ قسم کا تمباکو بھی استعمال کر سکتا ہے۔ جیسا کہ میں آکسفورڈ میں کیا کرتا تھا۔ آپ نے ایک اور کام بھی کیا ہے، جو تاریخی پہلو سے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، وہ یہ ہے کہ آپ نے ہندوستان میں لارڈ اروِن کی وضع کا ایک کنسرویٹو وائسرائے بھیجا (نعرۂ تحسین) اگر کسی شخص نے آج سلطنت برطانیہ کو تباہی سے بچایا ہے تو وہ یہی لمبا تڑنگا، دبلا پتلا سا عیسائی ہے (نعرۂ تحسین) اگر آج لارڈ اروِن ہندوستان میں نہ ہوتے تو خدا جانے اس ملک میں کیا ظہور میں آتا۔ کم سے کم میں اپنا "سیاسی عقیدہ" تبدیل نہ کرتا جیسا کہ میری نسبت سمجھا جاتا ہے۔ ہم اس وقت گول میز کے گرد بیٹھے ہوئے دکھائی نہ دیتے۔ ہم یہاں صلح، دوستی، اور آزادی کی خاطر آئے ہیں۔ اور مجھے امید ہے کہ ہم یہ تمام چیزیں لے کر واپس جائیں گے۔ اگر ہمیں یہ چیزیں نہ ملیں، تو ہم ملک کی لڑائی لڑنے والوں کی صفوں میں وہیں چلے جائیں گے، جہاں ہم دس سال

پہلے موجود تھے۔ وہ آج ہمیں مُلک کا غدّار کہتے ہیں۔ اُس وقت آپ ہمیں باغی کہہ لیجئے گا۔

حکومتِ ہند کی مراسلت

میں نے ہز اکسلنسی لارڈ اِروِن کے بارے میں کچھ کہا ہے، لیکن میں اِن باتوں کو اُن کی گورنمنٹ سے منسُوب کرنا نہیں چاہتا۔ ہندوستان کے اربابِ حل و عقد نے المناک طور پر معاملات کو درہم برہم کر رکھا ہے۔ حکومتِ ہند کی مراسلت کا صِرف یہی ایک اچھا پہلو ہے کہ اس نے ہمارے لئے ایک اور تاریخی دستاویز تیار کی ہے (کیونکہ ہمیں صِرف سائمن کمیشن کی رپورٹ ہی پر غور نہیں کرنا ہے) یہ مراسلت ایک نہایت یاس انگیز تحریر ہے۔ اس تحریر کے بعد سب سے اچھا کام ہم یہی کر سکتے ہیں کہ ہم یہاں اپنی ایک "تاریخی دستاویز" مُرتّب کریں۔ دونوں عظیم الشان مُلکوں کے بہترین دل و دماغ یہاں موجود ہیں۔ مگر بہت سے لوگ جنہیں آج یہاں ہونا چاہیئے تھا، ابھی تک ہندوستان کے جیل خانوں میں بند ہیں۔ مسٹر جیکر، سر تیج بہادر سپرو، اور میں نے وائسرائے اور گاندھی جی کے درمیان صُلح کرانے کی انتہائی کوشش کی، لیکن ہم ناکام رہے، سب سے پہلے اس مُہم میں میں نے قدم اُٹھایا، لیکن مجھے کامیابی نہ ہوئی، مجھے اُمید ہے کہ اس مرتبہ جب ہم اپنے مُلک کو واپس جائیں گے تو ہم آزادی کی سند ساتھ لے جانے میں ناکام نہیں رہیں گے۔

میں ہندوستانیوں سے بھی لڑ سکتا ہوں

لارڈ پیل نے کہا ہے "ہاں یہ ٹھیک ہے، لیکن جب آپ اپنے مُلک کو ایسا دستورِ اساسی لے کر واپس جائیں، جیسا آپ چاہتے ہیں تو وہ لوگ جو آپ سے تعاون نہیں کر رہے ہیں، دستور کو آپ کے ہاتھ سے چھین لیں گے ـــــ چھین لیں گے؟ یاد رکھئے جب میں انگریزوں سے لڑ سکتا ہوں تو میں ہندوستانیوں سے بھی لڑ سکتا ہوں، لیکن پہلے مجھے کوئی ایسی چیز تو دیجئے، جس کی خاطر میں لڑ سکوں، یہ نہ ہو کہ میں یہاں سے غلامی کی سند لے جاؤں، اور پھر آپ مجھ سے یہ توقع رکھیں کہ میں اپنے ہی لوگوں سے لڑوں (نعرۂ تحسین)، میں یہ نہیں کر سکتا اور اگر کروں بھی

تو ناکام رہوں گا۔ لیکن آزادی کی سند ہاتھ میں لے کر میں خوشی خوشی ان لوگوں کے پاس جاؤں گا، جس کے نام سے میرے دوست مسٹر جیکر نے تقریر کی ہے، اُنہوں نے نوجوان ہندوستان کی طرف سے بولنے کا دعویٰ کیا تھا۔ میرے خیال میں مسٹر جیکر کو اس بات کا علم ہے کہ گو میں عُمر میں اُن سے بڑا ہوں، لیکن مزاج اور طبیعت اور لڑنے کی خواہش کے اعتبار سے میں ابھی ایک نوجوان آدمی ہوں، میں اس وقت عدم تعاون کے اصول پر عمل پیرا تھا جب کہ مسٹر جیکر عدالتوں میں وکالت کرتے تھے (مسٹر جیکر نے اس موقع پر اپنا سَر ہلایا) بہر حال وہ میرے ساتھ جیل میں نہ تھے۔ میں اور میرا بھائی پہلے اشخاص تھے جنہیں لارڈ ریڈنگ نے جیل میں بھیجا۔ مجھے اس معاملے میں اُن سے کوئی شکایت نہیں (چیئرز) لیکن میں بھی وہی اختیار چاہتا ہوں کہ جب لارڈ ریڈنگ ہندوستان میں کسی جُرم کے مُرتکب ہوں تو میں بھی اُنھیں جیل میں بھیج سکوں۔

میں کامل آزادی چاہتا ہوں

میں آپ سے ڈومینین اسٹیٹس (درجہ مستعمرات) لینے کے لئے نہیں آیا ہوں، میں ڈومینین اسٹیٹس کا قائل نہیں ہوں۔ میں کامل آزادی کے عقیدے کا پابند ہوں ۱۹۲۷ء میں ہم نے مدراس میں ایک قرار داد منظور کی تھی۔ اور کامل آزادی کو اپنی منزلِ مقصود قرار دیا تھا۔ ۱۹۲۸ء کی آل پارٹیز کے کنونشن میں نہرو رپورٹ کو منظور کرنے کی تحریک پیش کی گئی تھی۔ اس دستور کی پہلی دفعہ ڈومینین اسٹیٹس کے متعلق تھی۔ میرے پُرانے سکرٹری پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی جو آج کانگریس کے صدر ہیں، ان کے باوا نے دبا دیا تھا، فارسی کی ایک ضرب المثل ہے: سگ باش برادرِ خُورد مباش" اور جب آپ دیکھتے ہیں کہ میرا بڑا بھائی وہاں بیٹھا ہے، جو بقول کرنل ویجوڈ ساٹ فٹ لمبا اور پانچ فٹ چوڑا ہے (قہقہہ) تو آپ خیال کر سکتے ہیں کہ میں اس فارسی ضرب المثل کا کیا قائل ہوں۔ جواہر لال کے معاملے میں یہ کہوں گا کہ "بلی بن جاؤ لیکن اپنے باپ کے بیٹے نہ بنو۔" کیونکہ یہ باپ ہی تھا جس نے کانگریس کی صدر کی حیثیت سے ۱۹۲۸ء کی کانگریس میں غریب جواہر لال کا گلا گھونٹا تھا۔

خیر اس وقت جب کہ وہ کامل آزادی کے لئے آواز بلند کرنے سے معذور تھے، اُن کی بجائے میں اُٹھا اور میں نے درجۂ مستعمرات والی دفعہ کی مخالفت کی لیکن ۱۹۲۹ء میں جواہر لال کی طرح میں نے آگے قدم نہ بڑھایا۔ اور اسے اپنا سیاسی عقیدہ نہ بنایا۔ کیونکہ کانگرس میں جب ایک مرتبہ ہم یہ سیاسی مسلک قائم کر لیتے، تو ہم کسی شخص کو جو یہ مسلک نہ رکھے، کانگرس میں داخل نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے گفت و شنید کے لئے بحث کا دروازہ کھلا رکھنا پسند کیا۔ میں کسی شخص پر یہ دروازہ بند کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہز ایکسیلینسی لارڈ اروِن جو ایک کنسرویٹو وائسرائے ہیں، "موقع کے آدمی"[1] تھے، اور جو کچھ اُنہوں نے موقع پر دیکھا، اس کا اُن پر کافی اثر پڑا۔ اور وہ یہاں آئے۔ (جب ہم لندن میں آتے ہیں تو ہم سُنتے ہیں کہ ہر شخص "عام آدمی"[2] سے اپیل کر رہا ہے۔ میں نہیں جانتا وہ "عام آدمی" کون ہے، لیکن لارڈ راورمیئر[3]، لارڈ بیوربروک[4] اور دوسرے اشخاص بھی "عام آدمی" کی نسبت ہمیشہ یہ کہتے ہیں کہ وہ مرافعہ کی آخری عدالت ہے۔ ہندوستان میں ہمیں "موقع کے آدمی" سے واسطہ پڑتا ہے۔ غرض "موقع کا آدمی" یہاں آیا اور اس نے "عام آدمی" سے جو ایک سربرآوردہ شخص ہے اور اس وقت صدرنشین[5] ہے، گفتگو کی۔ مجھے یقین ہے کہ اول الذکر نے ان لوگوں کو نصیحت کی، جو اپنے سیاسی عقائد تبدیل کر چکے تھے، اُنہوں نے مسٹر بالڈون کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیا۔ اُنہوں نے کچھ کنسرویٹو اصحاب کو ساتھ ملا لیا۔ اُنہوں نے ہر شخص کو اپنے امکان بھر اپنا ہم نوا بنا لیا۔ اور یہ اعلان کیا کہ جب انگریزوں نے ۱۹۱۷ء میں ذمہ دار حکومت کا اعلان کیا تھا، تو اس وقت ان کی مراد "ڈومینین اسٹیٹس" تھی۔

اس سے وہ پردہ اُٹھ گیا جو ۱۹۲۴ء کی انڈین لیجسلیٹو اسمبلی کے ایک قابلِ یادگار جلسے میں اس وقت ہوم ڈیپارٹمنٹ کے افسر انچارج نے اس معاملے پر ڈالا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ صاحب یہاں آج موجود ہیں۔

---

[1] MAN ON The Spot　[3] Rothermere

[2] MAN IN The Street　[4] Beverbrook　[5] وزیر اعظم برطانیہ۔

ایک کھوئی ہوئی ڈومینین

دو یا تین دن ہوئے، میں نے کہا تھا کہ ہندوستان کی رفتار بے حد تیز ہو چکی ہے، ہم منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے جبری کوچ کر رہے ہیں۔ جس سے دُنیا حیران رہ جائے گی۔ ہم اس وقت تک ہندوستان واپس نہیں جائیں گے، تاوقتیکہ برطانیہ میں ایک نئی ڈومینین پیدا نہ ہو جائے۔ ہم اگر اس نئی ڈومینین کی پیدائش کے بغیر ہندوستان واپس چلے گئے تو میرا خیال ہے کہ ہم ایک کھوئی ہوئی ڈومینین (سلطنت) میں جائیں گے، ہم ایک نئے امریکہ کو واپس جائیں گے۔ اس وقت آپ دیکھیں گے کہ برطانیہ کی دولتِ متّحدہ یا سلطنت، برطانیہ کے اندر نہیں، بلکہ اس کے بالکل باہر ایک اتحاد ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے بھی بہتر ہوگا۔ میں نے آکسفورڈ چھوڑنے سے تھوڑے عرصہ کے بعد یہ لکھا تھا کہ ہمیں ہندوستان میں جو کچھ ملے گا، وہ ایک امریکہ سے بہتر ہوگا۔ کیوں کہ امریکہ میں تو صرف "ریاست ہائے متّحدہ" ہی ہے لیکن ہندوستان میں ریاستوں کے علاوہ "مذاہبِ متّحدہ" بھی ہوں گے۔

ملکہ وکٹوریا کا پوتا

یہ ہیں، وہ جذبات جو ہمارے دلوں میں مُوجزن ہیں۔ اور جن کے ساتھ ہم یہاں آئے ہیں۔ اب اس کا انحصار ہمارے کنسرویٹو دوستوں، ہمارے ریڈیکل دوستوں، ہمارے لیبر والے دوستوں اور ان سے بھی زیادہ ایک شخص پر ہے، جس پر میں دوسرے تمام آدمیوں کی نسبت زیادہ اعتماد رکھتا ہوں۔ میرا رُوئے سخن ہز مجسٹی شاہ جارج کی طرف ہے، جو نیک دل وکٹوریہ کے پوتے ہیں۔ جس کی اُس محبت سے جو آنجہانی کو ہندوستان سے تھی، کوئی شخص انکار کرنے کی جُرات نہیں کر سکتا۔ اس کی تمام زندگی ہندوستان کا میگنا چارٹا (آزادی کی شاہی سند) تھی۔ اور اس کے پوتے کے زمانے میں تاریخ کے الفاظ اس طرح لکھے جائیں گے "جارج سوم

نے امریکہ کھودیا اور جارج پنجم نے ہندوستان جیت لیا" (نعرۂ تحسین)

تم نے ہندوستان کو نامرد بنا دیا

ہمیں بتایا جاتا ہے کہ اس معاملے میں بہت سی مشکلات ہیں' ہم سے کہا جاتا ہے کہ "ریاستوں کی طرف دیکھو" میں ریاستوں ہی سے آرہا ہوں' اور یقین سے کہتا ہوں کہ وہ ہمارے راستے میں کوئی رُکاوٹ نہیں ڈالتیں۔ (چیرز) پھر فوج کا سوال ہے' فرمائیے اس کی بابت آپ کیا کہیں گے؟ برطانیہ کے خلاف سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ آج ہندوستان کی فوج اپنی نہیں ہے۔ اور اگر آپ خود ہی فوج کا عُذر پیش کریں گے' تو اپنے ہی منہ سے اپنے آپ کو قابلِ ملامت قرار دیں گے' میں آپ کو صفائی اور ایمانداری سے لیکن دوستانہ طور پر کہے دیتا ہوں کہ آپ کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آپ نے ہندوستان کو مردانہ اوصاف سے محروم کر دیا (اظہارِ مسرّت)

بتیس ۳۲ کروڑ انسان ہلاک نہیں کئے جائیں گے

مجھے یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ میرے دوست ڈاکٹر مونجے بھی میرے اس قول پر اظہارِ مسرّت کر رہے ہیں' مجھے ان سے یہ سُن کر بہت رنج ہوا تھا کہ جب ہمارے آدمیوں پر گولیاں چلائی گئیں تو وہ بھاگ گئے اور پھر واپس آگئے۔ ہمارے پاس بتیس ۳۲ کروڑ آدمی ہیں۔ جب وہ قحط اور پلیگ سے لاکھوں کی تعداد میں بے بسی کی موت مرنا جانتے ہیں' تو وہ یقیناً برطانوی گولی سے جان دینے کی بھی توفیق رکھتے ہیں' یہی سبق ہے جو گاندھی جی نے ہمیں سکھانا چاہا اور یہی سبق ہے جو ہمیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے۔ جب گاندھی جی نے جنوبی افریقہ کی مُہم کا عَلم بلند کر رکھا تھا تو اس وقت یعنی ۱۹۱۳ئہ میں مَیں انگلستان میں تھا۔ الیکس ہال میں مسٹر جی کے چیسٹرٹن کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوا اور اس میں مجھے تقریر کرنے کے لئے کہا گیا' دوسرے مقرّرین نے گاندھی جی کے نئے فلسفے کا اپنی تقریروں میں ذکر کیا تھا' میں نے یہ کہا تھا کہ براہِ کرم اس نئے فلسفے کے متعلق

ایک بات کو سمجھ لیجئے، خواہ یہ فلسفہ گاندھی جی کا ہے یا ٹالسٹائی کا، یسوع مسیح کا ہے یا میرا۔ لیکن ہے وہی عالم گیر انسانی فلسفہ کہ کوئی شخص لڑائی میں کامیاب نہیں ہو سکتا، اگر اس کے دل میں محض مار ڈالنے کا ارادہ موجود ہو۔ آپ سب کو دوسرے کی جان لینے کا ارادہ کرنے سے پہلے اپنے دل میں مرنے کی خواہش پیدا کرنی چاہئے۔ ہندوستان میں مار ڈالنا ہمارے اختیار میں نہیں ہے، لیکن جب ہمارے دل میں مرنے کا شوق پیدا ہو جائے گا، تو اس وقت اعداد و شمار اس امر کی شہادت دیں گے کہ بتیس کروڑ انسانوں کو ہلاک نہیں کیا جا سکتا۔ دُنیا میں کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں ہوئی جس سے آپ بتیس کروڑ انسانوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے کا سامان مہیا کر سکیں۔ اگر آپ کے پاس کوئی ایسی مشین ہو اور سامان بھی ہو، تو پھر آپ کے پاس وہ اخلاقی طاقت یا بداخلاقی نہیں کہ آپ بتیس کروڑ انسانوں کو ہلاک کرنے کی جرأت کر سکیں۔ ہم میں ایک آزاد اور متحدہ قوم کی حیثیت سے ہندوستان کی زندگی کے لئے مرنے کی خواہش ہونی چاہئے۔ اور یہ خواہش ہم میں بڑی تیزی سے ہو رہی ہے۔ جب یہ خواہش ایک مُصمّم ارادہ کی صورت اختیار کر لے گی، تو پھر آپ کیا کر سکیں گے، میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس خیال کو اپنے دل میں جگہ نہیں دے سکتا کہ آپ کو سارے انگلستان میں ایک سو بھی ایسے شقی القلب آدمی مل سکیں گے جو ان نہتّے اور غیر متشدّد لوگوں پر فائر کرنے کے لئے تیار ہو جائیں، جو اپنے ملک کی آزادی کی خاطر مرنے پر آمادہ ہیں۔ نہیں، میں انگریز سپاہیوں کو ایسا بُرا نہیں سمجھتا۔

پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو

اصلی مسئلہ جس نے اس تمام عرصے میں ہمیں پریشان کر رکھا ہے، وہ ہندو مُسلم مسئلہ ہے۔ لیکن درحقیقت یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فوج کے مشکل مسئلے کی طرح ہندو مُسلم مسئلہ بھی آپ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ (ڈاکٹر مونجے! سُنو سُنو!!) لیکن معاملہ صرف اسی قدر نہیں ہے۔ یہ "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کا پُرانا اصول ہے

لیکن یہاں تقسیمِ عمل بھی ہے، پھوٹ اپنے آپ میں ہم ڈالتے ہیں اور حکومت آپ کرتے ہیں۔ جس وقت ہم نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ہم اپنے آپ میں یہ پھوٹ نہیں پڑنے دیں گے، آپ ہم پر اس طرح حکومت نہیں کر سکیں گے، جس طرح اب کر رہے ہیں۔ یہاں ہم اس مصمم ارادہ کے ساتھ آئے ہیں کہ ہم میں پھوٹ نہیں پڑے گی۔ میں ہر برطانوی مرد اور ہر برطانوی عورت کو جو ہماری قسمت کو ایک نئے مستقبل کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں، یقین دلاتا ہوں، کہ آج ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان صرف یہ جھگڑا ہے کہ مسلمان ہندو کے تفوق سے ڈرتا ہے۔ اور ہندو مسلمان کے تفوق سے۔ (ڈاکٹر مونجے اس موقع پر چیخ پڑے: نہیں ہندو کبھی نہیں ڈرتا)۔

خیر مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ ہمارے ملک میں بھینس صرف اس وقت حملہ کرتی ہے، جب وہ ڈر جاتی ہے۔ گائے کے لئے ہندو کے دل میں خواہ کتنا ہی احترام ہو، لیکن مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی ہے کہ ہندو بھینس سے کبھی نہیں ڈرتا۔ میں اس ڈر سے نجات پانا چاہتا ہوں، یہی واقعہ کہ آج ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں، ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی برطانوی تفوق کے روادار نہیں ہیں ہوں گے

برطانیہ کا اقتدار اور برطانیہ کی دوستی

یہ بات سمجھنے کے قابل ہے، ہندوستان پر برطانوی تفوق کا تو اب خاتمہ سمجھنا چاہئے لیکن کیا برطانیہ کے ساتھ ہماری دوستی کا بھی خاتمہ ہو جائے گا؟ میرے بھائی نے سترہ سال تک گورنمنٹ کی خدمت کی، لیکن انہوں نے میرے لئے ایک کام کیا۔ انہوں نے مجھے آکسفورڈ بھیجا۔ عدم تعاون کے دنوں میں وہ مجھے ہمیشہ یہ طعنہ دیتے رہے کہ "تمہارے دل کے کونے میں اس مقام کے لئے جسے آکسفورڈ کہتے ہیں، کچھ نہ کچھ محبت ضرور موجود ہے، مجھے تسلیم کرنا چاہیے کہ میرے دل میں آکسفورڈ کی محبت ضرور ہے۔ سب نے اپنی زندگی کے چار سال وہاں گزارے، میں اس زمانہ کے نہایت خوشگوار واقعات کی یاد کو ہمیشہ تازہ

رکھتا ہوں، اور میں چاہتا ہوں کہ یہ احساس قائم رہے۔ مجھے آکسفورڈ کی درس گاہ سے محبت ہے۔ میں اپنے بھائی کو بھی طعنہ دے سکتا ہوں۔ جب کراچی میں ہم پر مقدمہ دائر کیا گیا تو جیوری نے ہمیں بری کر دیا۔ اس جیوری میں ایک انگریز ممبر بھی تھا۔ لیکن سب ممبروں نے ہماری رہائی کے لئے ووٹ دیئے۔ کیوں کہ ہم بڑے مزے کے کھلاڑی تھے۔ اس وقت میرے بڑے بھائی نے کہا تھا" اگر یہ بات مجھ پر فرض قرار دی جائے گی کہ میں سب سے پہلے انگریز کو جو میرے سامنے ہے، موت کے گھاٹ اتار دوں اور اگر اس انگریز کی آنکھیں نیلی ہوں تو میرا چاقو اس پر وار نہیں کرے گا، کیوں کہ اس وقت مجھے اپنے پرانے کالج[1] کے سابق پرنسپل مسٹر تھیوڈر بیک آنجہانی کی آنکھیں یاد آجائیں گی۔ یہاں علی گڑھ کے کئی اولڈ بوائز موجود ہیں۔ اور وہ اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ ہم لوگ جو علی گڑھ میں بیک کی آغوش تربیت میں پلے ہیں، انگریزوں کی محبت کے خیال کو اپنے دل میں جگہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس لئے اگر ہندوستان میں برطانوی تفوق کا خاتمہ بھی ہو جائے اور اس کا خاتمہ یہیں ہو جانا چاہیئے، تو ہمیں برطانوی دوستی کا خاتمہ نہ کرنے دیجئے۔ برطانیہ کی ہمارے دلوں میں محبت ہے میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ اسے قائم رہنے دیجئے۔

پہلے خدا اس کے بعد جارج پنجم

میں ایک کلمہ اس وقت اپنی حیثیت کے متعلق لکھنا چاہتا ہوں، کسی دوسرے موقع پر میں اس موضوع پر اپنے مفصل خیالات کا اظہار کروں گا۔ انگلستان کے بہت سے لوگ ہم سے دریافت کرتے ہیں، کہ ہندو مسلم مسئلہ سیاسیات میں کیوں آجاتا ہے۔ اور اس کا ان باتوں سے کیا تعلق ہے؟ میرا جواب یہ ہے، کہ مذہب کو سیاسیات سے خارج کر دینے کے معاملے میں آپ نے مذہب کے متعلق ایک

---

[1] علی گڑھ

غلط خیال کو اپنے دل میں جگہ دے رکھی ہے۔ مذہب صرف عقیدہ یا رسم کا نام نہیں ہے۔ میرے نزدیک مذہب زندگی کے حقائق کا ترجمان ہے۔ مجھے اسلام کے صدقہ میں تہذیب، معاشرتی نظام، اور زندگی کا اُمید افزا مستقبل حاصل ہوا ہے۔ اسلام ان تمام باتوں کا مکمل مجموعہ ہے، جہاں خدا کے حکم کا سوال ہو، وہاں میں پہلے مسلمان ہوں، اور آخری وقت تک مسلمان رہوں گا۔ اگر آپ مجھے اسلام کی تہذیب، معاشرتی نظام، اور اخلاقیات کے بغیر اپنی سلطنت یا قوم میں داخل ہونے کے لئے کہیں تو میں کبھی داخل نہیں ہوں گا۔ میرا پہلا فرض یہ ہے کہ اپنے خالق کا حکم مانوں نہ کہ ہز مجسٹی ملک معظّم کا اور نہ اپنے رفیق ڈاکٹر مونجے کا۔ ڈاکٹر مونجے کا بھی پہلا فرض یہی ہے۔ جہاں تک کہ اس فرض کا تعلق ڈاکٹر مونجے کو ہر چیز سے پہلے ہندو ہونا چاہیئے۔ اور مجھے ہر چیز سے پہلے مسلمان ہونا چاہیئے۔

دُو دائرہ، اسلام اور ہندوستان

لیکن جہاں ہندوستان کا تعلق ہے، جہاں ہندوستان کی آزادی کا تعلق ہے، جہاں ہندوستان کی فلاح وبہبود کا تعلق ہے، میں پہلے ہندوستانی ہوں اور آخری وقت تک ہندوستانی رہوں گا۔ (نعرۂ تحسین) میرا تعلق دُو برابر کے دائرے سے ہے لیکن ان کے مرکز علیحدہ علیحدہ ہیں۔ ایک دائرہ ہندوستان ہے، اور دوسرا دُنیائے اسلام جب میں ۱۹۲۰ء میں وفدِ خلافت کے صدر کی حیثیت سے انگلستان میں آیا، تو میرے دوستوں نے کہا کہ "تمہارے خط وکتابت کے کاغذوں پر کوئی خاص نشان ہونا چاہیئے، میں نے فیصلہ کیا کہ میرے کاغذوں پر دُو دائرے کے نشان ہوں گے۔ ایک دائرہ میں ہندوستان کا لفظ لکھا تھا اور دوسرے میں اسلام اور خلافت کے الفاظ درج تھے۔

قومیت کی جنگ اور دین کا جہاد

ہم مسلمان، ہندوستان کی حیثیت سے دونوں دائروں سے تعلق رکھتے ہیں، ہر دائرہ تیس کروڑ نفوس سے زیادہ آبادی کا ہے، ہم کسی دائرہ کو نہیں چھوڑ سکتے، ہم قومیت پرست نہیں ہیں، بلکہ قوم پرستوں سے بھی کچھ اُوپر ہیں۔ اور میں ایک مسلمان کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ خدا نے انسان کو بنایا اور شیطان نے قوموں کو۔ قومیت انسانوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کرتا ہے۔ دُنیا کی مذہبی جنگیں اور صلیبی لڑائیاں اس قدر تباہی خیز اور ہولناک نہ تھیں جیسی آپ کی گذشتہ جنگِ عظیم تھی۔ اور یاد رکھیئے وہ آپ کی قوم پرستی کی جنگ تھی۔ میرے جہاد کی جنگ نہ تھی۔

غلط تاریخ کی تعلیم

لیکن جہاں ہمارے مُلک کا تعلق ہے، جہاں ٹیکس کے سوال کا تعلق ہے، جہاں ہماری فصلوں کا تعلق ہے، جہاں موسم کا تعلق ہے، جہاں ان تمام ادارات کا تعلق ہے، جن سے روزمرہ کی زندگی کے ہزاروں معاملات وابستہ ہیں۔ اور جو ہندوستان کی فلاح و بہبود کے لئے ہیں۔ وہاں میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں، اور فلاں ہندو ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں کے متعلق کوئی غلطی نہ کیجئے۔ یہ جھگڑے ایک دوسرے کے تفوق کے ڈر پر مبنی ہے۔ اگر ہندوستانیوں کو کمزور اور نامرد بنانے کے علاوہ میں انگریزوں پر کسی دوسرے گناہ کا الزام عائد کرتا ہوں، تو وہ گناہ یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے متعلق غلط تاریخیں لکھی ہیں۔ اور وہی تاریخیں سارے مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مدرسوں کے لڑکے ہندوستان کی غلط تاریخ کو اپنے دماغ میں جگہ دے لیتے ہیں، جو بلوے بعض اوقات خاص تیوہاروں کے موقع پر گلی کوچوں میں رُونما ہوتے ہیں،

وہ وہی ہیں جن کا تصوّر غلط تاریخ پڑھا کر ہمارے نام نہاد "روشن خیال" حضرات کے دماغوں کے اندر بٹھایا جاتا ہے، تاکہ اس سے سیاسی اغراض پُوری ہوں، میرے نزدیک یہ حضرات روشن خیال نہیں ہیں۔

ہندوؤں اور مُسلمانوں کا مسئلہ

اگر مسلمان ہر جگہ ۲۵ فیصد کے حساب سے اقلیت میں اور ہندو ہر جگہ ۶۶ فیصد کے حساب سے اکثریت میں ہوتے تو آج مجھے اُمید کی کوئی کرن نہ دکھائی دیتی، لیکن بھلا ہو ہمارے اولیاء اور مجاہدین کا کہ اگر ایک طرف ہندوستان میں ایسے صُوبے ہیں، جیسے ہمارے دوست ڈاکٹر مونجے کا صُوبہ ہے، جس میں ہم صرف ۴ فیصد ہیں۔ تو دوسری طرف ایسے صُوبے بھی ہیں جن میں ہم ۹۳ فیصد ہیں، جیسا کہ میرے دوست نواب سر عبدالقیوم کا صُوبہ ہے، جس کے لئے ہم مساوی آزادی کا مطالبہ کر رہے ہیں؛ سندھ کے پُرانے صُوبے کو لیجئے، جہاں مسلمانوں نے سب سے پہلے قدم رکھا اور جہاں ان کی تعداد ۷۳ فیصد ہے۔ پنجاب میں وہ ۵۶ فیصد ہیں اور بنگال میں ۵۷ فیصد۔ ان اعداد و شمار سے ہمارے حقوق کے تحفّظ کی صورت پیدا ہوئی ہے۔ کیوں کہ ہم ہندو "یرغمالوں" کا مطالبہ کرتے ہیں، جیسا ہم نے اپنی رضامندی سے ہندوؤں کو ان صُوبوں میں یرغمال دے رکھے ہیں، جہاں ان کی حاوی اکثریت ہے۔

ہندوستان میں اکثریت کا راج

میں چاہتا ہوں، آپ اس بات کو سمجھ لیں کہ آپ پہلی مرتبہ ہندوستان میں ایک بہت بڑے اِنقلاب کو رائج کر رہے ہیں۔ ہندوستان میں پہلی مرتبہ اکثریت کی حکومت کا قاعدہ رائج ہونے والا ہے۔ مہاراج رام چندر کے زمانے میں اکثریت کی کوئی حکومت نہ تھی اور اگر ایسا ہوتا تو اُنھیں جلاوطن کیوں ہونا پڑتا۔ عہدِ قدیم کے پانڈو اور کورو حُکمران جو اپنی سلطنتیں جُوا میں ہار گئے، اکثریت کے نشان وہ حُکمراں نہ تھے۔ محمود غزنوی

اکبر اور اورنگ زیب کے زمانے میں بھی اکثریت کی حکومت نہ تھی اور نہ شیواجی کے زمانے میں۔ جب رنجیت سنگھ پنجاب پر حکمرانی کر رہا تھا، اُس وقت بھی اکثریت کی حکومت نہ تھی، جب وارن ہسٹنگ اور کلائیو حکومت کر رہے تھے، اس وقت بھی اکثریت کا اقتدار نہ تھا۔ خود لارڈ ارون کے عہد میں بھی اکثریت کی حکومت نہیں ہے۔ ہم ہندوستان میں پہلی مرتبہ اکثریت کے اقتدار کو رائج کر رہے ہیں، اور میں ایک اقلیت سے تعلق رکھنے کے باوجود اکثریت کے اقتدار کو تسلیم کرتا ہوں اصلانکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اگر ۵۱ آدمی دُو اور دُو کو پانچ کہیں اور ۴۹ یہ کہیں کہ دُو اور دُو چار ہوتے ہیں تو صرف دُو اور دُو پانچ کہنے سے دُو اور دُو پانچ نہیں ہو جائنگے۔ لیکن پھر بھی اکثریت کے اقتدار کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اس لئے کہ خوش قسمتی سے بعض صُوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت بھی ہے۔

فیڈرل نظامِ حکومت

فیڈرل (وفاقی) طرزِ حکومت جو ہندوستان کے لئے نہ صرف ہندو مسلم سوال حل کرنے کی غرض سے موزوں بلکہ والیانِ ریاست کے لئے بھی ضروری ہے۔ ہمارے حق میں ہے۔ ہندوستان میں وفاقی اور وحدانی رُجحانات کا توازن ایسا صحیح واقع ہوا ہے کہ ہم وفاقی حکومت کے نظام کو کوئی دُور دراز یا بعید نصب العین قرار نہیں دیتے۔ جیسا حکومتِ ہند کہتی ہے، بلکہ ہم اس نصب العین کو عملی صورت میں آج دیکھنا چاہتے ہیں اور ابھی! اسی لمحے میں! (نعرۂ تحسین) ہم اس کانفرنس سے صرف اس وقت جائیں گے، جب ہندوستان میں فیڈریشن قائم ہو جائے گا۔ اور تاج اور والیانِ ریاست کے درمیان رضامندانہ معاہدات ہو جائیں گے۔

اعلیٰ حضرت اور ادنیٰ حضرت

میں بعض اوقات یہ سُنتا ہوں کہ " والیانِ ریاست کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا نہیں" اعلیٰ حضرت ! " ہم ادنیٰ حضرات آپ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کریں گے - لیکن جب ۱۸۵۸ء کے خاتمے پر الیسٹ انڈیا کمپنی کے اختیارات تاج برطانیہ کو منتقل ہو گئے تو اس وقت کسی شخص کو آپ کی رضامندی حاصل کرنے کا خیال نہ آیا - کسی نے "آپ کی اجازت" کا فقرہ استعمال کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی - اب آپ کے تعلقات انگلستان کے بادشاہوں کے خاندان سے قائم ہو گئے جو درحقیقت اچھے آدمی ہیں اور صرف اپنے ضمیر کے محکوم ہیں - اور یہی وہ بات ہے جو ہمیں اُمید دلاتی ہے -

فوج کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ

میں چند باتیں فوج کے متعلق بھی کہنی چاہتا ہوں اور پھر اپنی تقریر ختم کردوں گا میں اس وقت فوج کے متعلق ایک راز کا انکشاف کر رہا ہوں - آج سے دس سال قبل جب ہز رائل ہائینس ڈیوک آف کناٹ ہندوستان میں مجالسِ قوانین کی افتتاحی رسم ادا کرنے کے لئے بھیجے گئے " تو ہمارے عزیز دوست سی - آر - داس آنجہانی نے اس تقریب پر گاندھی جی ' پنڈت موتی لال نہرو ' اور مجھ کو مدعو کیا تھا - آج اس میز پر ہماری آنکھیں مسٹر داس کو تلاش کرتی ہیں جو اگر زندہ ہوتے ' تو آج پنڈت موتی لال نہرو اور گاندھی جی کو اس کانفرنس میں ضرور لاتے - گاندھی جی اور میں مسٹر داس کے ہاں مہمان کی حیثیت سے ٹھہرے ہوئے تھے - میں گاندھی جی کا "لارڈ چیمبرلین" تھا - کثیر التعداد لوگ گاندھی جی کو دیکھنے اور ان کے پاؤں چومنے کے لئے آئے تھے - ان لوگوں میں میں نے دس یا بارہ لمبے قد کے آدمی دیکھے جن کے سر پر

پگڑیاں تھیں ۔ اُنہوں نے کوئی وردی تو نہیں پہن رکھی تھی، لیکن باوردی سپاہیوں کی طرح معلوم ہوتے تھے ۔ میں نے خیال کیا کہ یہ غالباً محکمۂ سی ۔ آئی ۔ ڈی سے تعلق رکھتے ہوں گے ۔ جب میں ۱۹۱۵ء میں ایک ہمسایہ مخبر کی اطلاع پر گرفتار اور نظر بند کر دیا گیا، تو اس وقت میرا یہ عقیدہ ہے کہ دُنیا میں کوئی ایسی جگہ نہیں، جہاں خدا نہ ہو اور سی آئی ڈی والے نہ ہوں ۔ بس جو کچھ میں کہتا ہوں اور جو کچھ میں کرتا ہوں، اس کو یقین کے ساتھ کرتا ہوں کہ خالقِ اکبر اور سی آئی ڈی کے کارکن برابر حاضر و ناظر ہیں ۔ میں ان مفروضہ مخبروں کے پاس گیا اور ان سے کہا فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں ۔ میں سڈیشن (بغاوت) کی شکل میں سی آئی ڈی کے لئے بہت کچھ مسالا مہیا کرتا رہا ہوں ۔ اور اگر ضرورت ہو تو اب اور بھی مہیا کر سکتا ہوں ۔ (قہقہہ) ۔

اُنہوں نے کہا "ہم سی آئی ڈی کے آدمی نہیں ہیں، ہمارا تعلق فوج سے ہے، اس پر میں نے اُن سے پوچھا کہ "پھر اس مکان میں جہاں باغی لوگ رہتے ہیں، آپ کا کیا کام ہے؟" اُنہوں نے جواب دیا "ہم گاندھی جی کو سلام کرنے کے لئے آئے ہیں ۔ ہمارا تعلق اس گارڈ سے ہے، جو ڈیوک آف کناٹ کے لئے پُونا سے آئی ہے"۔

میں اُنہیں سیدھا گاندھی جی کے پاس لے گیا ۔ گاندھی جی نے اُن سے دریافت کیا کہ کیا تمہیں سوراج کی تحریک سے دلچسپی ہے؟ اُنہوں نے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا ۔ (مولانا محمد علی جو بعذرِ علالت بیٹھ کر تقریر کر رہے تھے یکایک کھڑے ہو گئے) میں انگریزی فوج کے احترام کے خیال سے کھڑا ہو جاتا ہوں ۔ اور ان سپاہیوں کے الفاظ کو دُہراتا ہوں، گاندھی جی نے اُن سے کہا "کیا تم لوگوں کو جن کا تعلق فوج سے ہے، سوراج کی تحریک سے دلچسپی ہے؟ نہیں! جو پُونا سے ڈیوک آف کناٹ کی حفاظت کے لئے یہاں لائے گئے ہو، کیونکہ فوجی افسر اپنی پہلی پریزیڈنسی[1] کے لوگوں پر بھروسہ نہیں کر سکتے"۔

---

[1] مُراد ۔ بنگال ۔

فوج والے کیوں سوراج چاہتے ہیں

اس کے جواب میں سپاہیوں نے کہا" اگلے دن کی بات ہے کہ ہمارے کرنیل نے پریڈ میں ہنستے ہنستے ہم سے گاندھی جی کی نسبت یہ کہا" کیا تم جانتے ہو کہ بنیا گاندھی ہندوستان کے لئے سوراج چاہتا ہے؟" کرنل ہنسا اور پھر اس نے ہم سے پوچھا" کیا تم بھی سوراج چاہتے ہو؟ کرنل کو بلاشبہ ہم سے یہی توقع تھی کہ ہم سب کا جواب" نہیں جناب" ہوگا، لیکن رجمنٹ نے سکون و وقار کے ساتھ جواب دیا" ہاں جناب! ہم بھی ہندوستان کے لئے سوراج چاہتے ہیں" اس پر کرنل نے جسے یہ جواب سُن کر سخت صدمہ ہوا تھا، دریافت کیا" تم کیوں سوراج مانگتے ہو؟" انہوں نے جواب دیا جب ہم یورپ میں لڑنے کے لئے بھیجے گئے تو ہم نے بلجیمی سپاہیوں کو دیکھا، جو شکست کھا کر واپس آرہے تھے، وہ بڑے فخر سے ہر شخص کو جو ان سے پوچھتا تھا کہ تم کس ملک کے سپاہی ہو، یہ جواب دیتے ہم بلجیمی سپاہی ہیں - ہمارا تعلق بلجیم کی فوج سے ہے - اسی طرح فرانس کے سپاہی بھی جب بعض اوقات میدانِ جنگ سے بھاگ کر آتے تھے، سوال کرنے والے کو بڑے فخر کے ساتھ یہی جواب دیتے تھے کہ ہم فرانس کے سپاہی ہیں۔ برطانوی سپاہیوں کا بھی یہی جواب تھا۔ لیکن ہندوستانی سپاہیوں نے کہا" اس حالت میں بھی کہ ہم فتح یاب رہے اور ہم نے اکتوبر ۱۹۱۴ء میں ایک نازک موقع پر فرانسیسی ساحل کو دشمنوں کے حملے سے بچایا۔ اس سوال کے جواب پر کہ ہم کون ہیں، اسی فخر کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہمارا تعلق ہندوستان کی فوج سے ہے۔ ہمیں یہ کہنا پڑتا تھا کہ سرکار انگریزی کی فوج کے سپاہی ہیں۔

دیکھئے ۔ اب ان سپاہیوں نے بھی یہ کہا کہ وہ فخریہ انداز میں یہ کہنا چاہتے تھے کہ ہم ہندوستانی فوج کے سپاہی ہیں۔

میں کہتا ہوں یہ ہندوستانی فوج کے متعلق ایک امر واقعہ ہے، ایک آسمانی صداقت ہے۔ آپ اس معاملے میں ہندوستانی فوج سے استصواب رائے کیجئے۔ خالقِ حقیقی بھی موجود ہو اور انگریز مُجبر بھی موجود ہوں، (قہقہہ) لیکن اس موقع پر ہم میں سے بھی چند لوگ موجود ہوں۔ پھر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہمیں اس معاملے کا زیادہ علم ہے، اور کوئی شخص ہم سے زیادہ باخبر نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ ایمان داری سے چاہیں کہ ہندوستان اپنی حفاظت کا بار اپنے سر لے لے تو وہ آج بھی اپنی حفاظت کرنے کے لئے تیار ہے۔

ہندوستانی بھی حکومت کے اہل ہیں

حکومتِ ہند نے اپنے مراسلے میں سر جان سائمن کی رپورٹ سے بھی ایک قدم آگے بڑھایا۔ حکومتِ ہند نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ فوج کو انگلستان کی گورنمنٹ کے ماتحت نہیں بلکہ حکومتِ ہند کے ماتحت ہونا چاہیئے۔ اس وقت حکومتِ ہند کے تین ارکان موجود ہیں۔ جن کے چمڑے کا رنگ وہی ہے جو میرے چمڑے کا ہے اور بعض کا تو میرے چمڑے سے بھی زیادہ سیاہی مائل ہے، اِن میں سے دونوں طالب علم کی حیثیت سے انگلستان میں میرے رفیق رہ چکے ہیں۔ اور تیسرے نے بھی اسی وقت یہیں تعلیم پائی۔ اگر یہ لوگ فوج کی نگرانی کر سکتے ہیں تو سر تیج بہادر سپرو ہندوستان کے وزیرِ اعظم کیوں نہیں ہو سکتے؟ سر محمد شفیع یا مسٹر جناح کیوں ہندوستان کے وزیرِ اعظم نہیں بن سکتے۔ اور کیوں فوجی معاملات کی باگ اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتے؟ اور مجھ جیسا حقیر آدمی یا میرا بڑا بھائی کیوں نہیں کمانڈر انچیف ہو سکتا ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ میری تقریر نے آپ کے صبر و تحمّل کے پیمانے کو لبریز کر دیا ہوگا۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری تقریر خود میرے لئے بھی صبر آزما اور قوتِ گویائی کو سلب کر لینے والی ثابت ہوئی ہے۔ اب میں رخصت ہوتا ہوں۔

اور مجھے اُمید ہے کہ پلینری کانفرنس میں مجھے دوبارہ تقریر کرنے کے لئے طلب نہیں کیا جائے گا۔ جب تک جنابِ صدر! آپ یہ اعلان نہ کردیں کہ ہندوستان بھی انگلستان ہی کی طرح آزاد ہے۔ (انقلاب ۲۵ جنوری ۱۹۳۱ء)

خانہ ویرانی

(مولانا محمد علی جوہر)

گھر چھٹا یوں کہ چھوڑنے والے
تھے نہ ہم اس کے آستانے کے

اک اک کر کے سب کے سب تنکے
گئے برباد آشیانے کے

کچھ دنوں گھومنا مقدر تھا
ساتھ ساتھ اپنے آب و دانے کے

دیکھئے اب یہ گردشِ تقدیر
کہیں آنے کے ہیں نہ جانے کے

محمد علی جوہر

حمد و نعت

تجھے تسکینِ جاں پایا، تجھے آرامِ جاں پایا
نہاں بھی ہے تو کیا تجھ کو جہاں ڈھونڈا وہاں پایا

ہمیں ہر چیز میں آئی نظر یارب ادا تیری
وہ کیسے ہوں گے جن لوگوں نے تجھ کو بے نشاں پایا

کوئی نامہرباں ہو کر ہمارا کیا بگاڑے گا
کرم تیرا تو ہے ہم پر تجھے تو مہرباں پایا

ترا وہ مبتلا ناکام سمجھا جس کو دنیا نے
اُسی کو سرخرو دیکھا اُسی کو کامراں پایا

عنادل ہیں، چمن کی تیرے فصلِ گل سے بے پروا
محبت کو تری ہم نے بہارِ بے خزاں پایا

حرم میں تھا ہر اک کو یوں تو تیرے عشق کا دعویٰ
جو کی تحقیق تو اکثر وہی عشقِ بُتاں پایا

ہماری جان بھی حاضر ہے اسکے اک اشارے پر
کہ جس کو اک جہاں نے آپ ہی جانِ جہاں پایا

کسی کو ڈھونڈتا دیکھو، خود اپنے گوشۂ دل میں
تو بس سمجھو کہ اب اس نے سراغِ لامکاں پایا

رہا آوارۂ دیر و حرم پہلو سے بیگانہ!
دل اس کا عرش کرسی ہے کہاں ڈھونڈا کہاں پایا

خجل خود خجلتِ تر دامنی سے ہو گئے عاصی
تری رحمت کو جب دیکھا تو بحرِ بیکراں پایا

جہاں ایماں ہو واں کیسے گذر ہو یاس و حرماں کا
کسی مومن کو بھی اے دل خدا سے بدگماں پایا

نہیں سرکش کی سرکوبی میں وہ محتاجِ قوت کا
اسی کو چُن لیا جس کو ضعیف و ناتواں پایا

وہ ساقی جس نے تلچھٹ تک نہ رکھی فکرِ فردا میں
اسے کوثر پہ ہم نے قبلہ گاہِ میکشاں پایا

نہیں معلوم کیا ہو حشر جو ہر کا پتہ اتنا ہے
کہ ہاں نامِ محمدؐ مرتے دم وردِ زباں پایا

(پیام کلکتہ ۱۱ر جون ۱۹۳۱ء)

محمد علی جوہر

نعت

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں

ہر لحظہ تشفّی ہے، ہر آن تسلّی ہے
ہر وقت ہے دلجوئی، ہر دم ہیں مداراتیں

کوثر کے تقاضے ہیں تسنیم کے وعدے ہیں
ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتیں!

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

بے مایہ ہیں ہم لیکن شاید وہ بلا بھیجیں

بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

شیطان کی چالوں سے اب ہوتے ہیں سب واقف

اب ہونگی الم نشرح ملعون کی سب گھاتیں

بیٹھا ہوا توبہ کی تو خیر منایا کر !

لگتی نہیں یوں ہم کو ہر اس دیس کی برساتیں

(پیام کلکتہ ۱۱ جنوری ۱۹۳۱ء)

محمد علی جوہر

شہنشاہِ کونین کا عاشق

بارگاہِ نبوی میں مولانا محمد علی کی عقیدت کے پھول

فریضۂ حج سے فارغ ہونے کے بعد مدینہ طیبہ کی منزلیں طے کرتے ہوئے رئیس الاحرار مولانا محمد علی پر ایک خاص عالم شوق طاری تھا۔ آپ نے آخری منزل میں حسب ذیل نظم کہی جسے آپ باآوازِ بلند پڑھتے جاتے تھے۔ اور آپ کی آنکھیں عشقِ رسول میں موتی بکھیر رہی تھیں۔ "الامان"

ذیل میں وہ منظوم تاثرات درج کیے جاتے ہیں جو مولانا الحاج محمد علی مرحوم نے مدینہ منورہ جاتے وقت آخری منزل میں کہے تھے۔ اور جنہیں وہ آبیار علی سے چلتے ہوئے ایک خاص عالم شوق میں پڑھتے جاتے تھے۔

(مدینہ بجنورہ ۲۵ر جنوری ۱۹۳۱ء)

سب سمجھتے ہیں کہ تو شاد ہے مسرور ہے آج
کون کہتا ہے دلا، تو دلِ رنجور ہے آج

کلفتِ قطعِ منازل ہوئی کافور ہے آج!
ہے مدینہ سے جو نزدیک تو سب دور ہے آج

اپنے پلّے کوئی سوغات نہیں اس کے سوا
نقدِ جاں نذر کرائے دل یہی دستور ہے آج

سنگِ در تک تو بہر کیف رسائی بخشی
دیکھوں کیا کیا مرے سرکار کو منظور ہے آج

آرزوہائے دو عالم تھیں اور ایک دل کل تک
فقط اک تیری تمنا ہے جو معمور ہے آج

رقصِ بسمل کی ذرا دیر اجازت دیجئے
حسن مسئول نہیں عشق بھی مجبور ہے آج

عشق خود بدعت و سرمایۂ صد بدعت ہے
رحم کر رحم کہ عاشق ترا معذور ہے آج

اب بھی دیدار سے محروم ہی رکھے گا ہمیں
تھی جو اک حسرتِ پابوس بدستور ہے آج

پہنچ گیا بھی جو انا لحق سے تو انت الحق ہے
میرے نعرے میں بھی کچھ مستیٔ منصور ہے آج

لن ترانی کی یہاں بھی وہی آتی ہے صدا
ہے گماں قبۂ خضرا شجرِ طور ہے آج

چھوڑ فقہی کے لئے مسئلۂ موت و حیات
ایک جلوہ ہے عیاں تھا، کبھی مستور ہے آج

جس سے چہرے دمک اٹھتے تھے کبھی یثرب کے
دیکھو جو ہر کسی آنکھوں میں وہی نور ہے آج

محمد علی جوہر

یادِ وطن

یادِ وطن نہ آئے ہمیں کیوں وطن سے دور
جاتی نہیں ہے بوئے چمن کیا چمن سے دور

مستِ مئے الست کہاں اور ہوس کہاں
طرزِ وفائے غیر ہے اپنے چلن سے دور

گر بوئے گل نہیں نہ سہی یادِ گل تو ہے
صیاد لاکھ رکھے قفس کو چمن سے دور

کچھ بھی وہاں نہ خنجرِ قاتل کا بس چلا
روحِ شہید رہتی ہے نعش و کفن سے دور

تقویٰ کے بعد خوف کہاں، حزن پھر کہاں
عالم ہی اک جدا ہے وہ رنج و محن سے دور

واعظ کا ارتداد نہ میرا ہے ترکِ کفر
کچھ بھی نہیں ہے ساقیٔ توبہ شکن سے دور

پاداشِ جرمِ عشق سے کب تک مفر ملا
مانا کہ تم رہا کئے دار و رسن سے دور

ہے بعدِ کربلا سے بھی قربِ یزید بھی
اور چاہتے ہیں یہ کہ نہ ہوں پنجتن سے دور

یوں بچ سکو مواخذۂ حشر سے تو ہاں
مارو دیارِ غیر میں ہم کو وطن سے دور

آساں نہ تھا تقربِ شیریں تو کیا ہوا
تیشہ کو کوئی رکھ نہ سکا کوہکن سے دور

مسلم اجل سے دور نہیں روزِ کربلا
رہتا نہیں برات میں دولہا دلہن سے دور

منقارِ عندلیب کو صیاد سی چکا
مانا کہ گوشِ گل ہے لبِ نالہ زن سے دور

اللہ رے نورِ چشمِ محبت کی جستجو!
نکلا اسیرِ مصر نہ کچھ بھی وطن سے دور

ہم تک جو دورِ جام پھر آئے تو کیا عجب
یہ بھی نہیں ہے گردشِ چرخِ کہن سے دور

منعمِ مفت خور کو سب کچھ حلال ہے
بوئے شرابِ شرک ہو پھر کیوں دہن سے دور

دستِ دراز کو ترے اے رندِ باصفا
رکھے خدا عمامۂ شیخِ زمن سے دور

تاویل بڑھ کے اقرب للکفر ہو گئی — کچھ بھی نہیں ہے شیخ ترے علم و فن سے دور
ہیں اتنے لاف و شوق پہ مرعوبِ تسنن بھی — یہ طائفہ عجیب ہے اک مرد و زن سے دور
تم ہو تو نذرِ عشق نہ لکھیں وہ مرثیہ — یہ بات ہے مروّتِ اہلِ سخن سے دور
تم سے بعید تھا کہ بھلا دو اگرچہ ہم — ایک عمر ہو گئی کہ ہوئے انجمن سے دور

شاید کہ آج حسرتِ جوہر نکل گئی
اک لاش تھی پڑی ہوئی گور و کفن سے دور

غمخوارِ وطن

نہالؔ سیوہاروی

غمخوارِ وطن تھا سب سے بڑھ کر جوہرؔ — احرار کا تھا امیرِ لشکر جوہرؔ
صد حیف کہ وہ جوہرِ یکتا نہ رہا — فریاد کناں ہے خلق جوہرؔ جوہرؔ

محمد علی جوہر

خوگرِ جور

خوگرِ جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی
اسقدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی

خوفِ غمازہ، عدالت کا خطر جان کا ڈر
ہیں جہاں اتنے وہاں خوفِ خدا اور سہی

عہدِ اوّل کو بھی اچھا ہے جو پورا کر دو
تم وفادار ہو تھوڑی سی وفا اور سہی

جس نے ہنگامۂ عدالت کا تری دیکھا ہے
اس گنہگار کو اک روزِ جزا اور سہی

کشورِ کفر میں کعبہ کو بھی شامل کر لو
سیرِ ظلمات کی تھوڑی سی فضا اور سہی

بندگی میں تری ہم سہتے ہیں لُو کی لپٹیں
چند دن کے لئے دوزخ کی ہوا اور سہی

دین و دل جا بھی چکا جان بھی جاتی ہے تو جائے
ترکشِ کفر میں اک تیرِ قضا اور سہی

ربِ عزت کے لئے بھی کوئی رہنے دو خطاب
تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

حکمِ حاکم نہ سہی مرگِ مفاجات سے کم
مالک الملک پہ ایماں کی سزا اور سہی

ہم وفاکیشوں کا ایماں بھی ہے پروانہ صفت
شمعِ محفل جو وہ کافر نہ رہا اور سہی

محمد علی جوہر

دورِ حیات

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد
جینا وہ کیا کہ دل میں نہ ہو تیری آرزو
باقی ہے موت ہی دلِ بے مدعا کے بعد
تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد
اک شہرِ آرزو پہ بھی ہونا خجل پڑا
ھل من مزید کہتی ہے رحمت دعا کے بعد
لذت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں
آتا ہے لطف جرمِ تمنا سزا کے بعد
قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد
غیروں پہ لطف ہم سے الگ حیف ہے اگر
یہ بے حجابیاں بھی ہوں عذرِ حیا کے بعد
ممکن ہے نالہ جبر سے رک بھی سکے مگر
ہم پر تو ہے وفا کا تقاضا جفا کے بعد

محمد شفیع جیوری

راضی برضا

ہر رنگ میں راضی بہ رضا ہو تو مزا دیکھ
دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ

ہے سنتِ ارباب وفا صبر و توکل
چھوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامانِ خدا دیکھ

دشتِ رہِ غربت میں اکیلا تو نہیں تو!
بطحا کے مہاجر کا تو نقشِ کفِ پا دیکھ

تو طیرِ ابابیل سے ہرگز نہیں کمزور
بیچارگی پہ اپنی نہ جا شانِ خدا دیکھ

اس طرح کے جینے میں بھی مرنے کا مزا ہے
قسمت میں یہی ہے کہ ابھی راہِ قضا دیکھ

ہم کہہ نہیں سکتے وہ کریں چارہ گری بھی
حالِ دلِ بیمار طبیبوں کو سنا دیکھ

اللہ کے بانکوں کا بھی ہے رنگ نرالا!
اس سادگی پہ شوخیٔ خونِ شہدا دیکھ

یہ نورِ خدا کا ہے، بجھائے نہ بجھے گا
کچھ دم ہے اگر تجھ میں تو آ تو بھی بجھا دیکھ

سمجھا بھی ہے کچھ تو کہ، یہ ہے کس سے تمرّد
اللہ کو مان اپنی حقیقت کو ذرا دیکھ!

ہوں لاکھ نظر بند دعا بند نہیں ہے
اللہ کے بندوں کو نہ اسدرجہ ستا دیکھ

ہو حسنِ طلب لاکھ مگر کچھ نہیں ملتا
ہو صدقِ طلب، پھر اثرِ آہِ رسا دیکھ

خو تیری دو روزہ، مرا ایماں ہے ازل کا
پابندِ جفا تو ہے تو میری بھی وفا دیکھ

عقبیٰ تو کہاں واں نہیں دنیا کا بھی کچھ ٹھیک
اس کافرِ بے فیض سے دل تو بھی لگا دیکھ

سونے کا نہیں وقت یہ ہشیار ہو غافل
رنگِ فلکِ پیر زمانے کی ہوا دیکھ!

محمد علی جوہر

ظرفِ قدح خوار

ہے رشک کیوں یہ ہم کو سرِ دار دیکھ کر
دیتے ہیں بادہ، ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

خوگر وہ ہے ازل سے تجلّیِ طور کی
جھپکے گی آنکھ کیا تری تلوار دیکھ کر

آساں پسندیوں سے ہیں بیزار اہلِ عشق
پچھتا نہ یہ مرحلہ بھی ہے دشوار دیکھ کر

بن جائے گا یہ رشتۂ تسبیح ایک دن
دھوکہ نہ کھائیو کہیں زنار دیکھ کر

اس شانِ اتقیا کو دیکھیں کہ اہلِ کفر
مومن سمجھ رہے ہیں ہمیں خوار دیکھ کر

جنسِ گراں تو تھی نہیں کوئی مگر یہ جاں
لائے ہیں ہم بھی رونقِ بازار دیکھ کر

تیری نگہ نے کر دیا دونوں کا فیصلہ
باہم دل و جگر میں یہ تکرار دیکھ کر

یہ کیا کہ سجدہ گاہ ہے ہر سنگِ آستاں
گھسنا جبیں کو خانۂ خمار دیکھ کر

محمد علی جوہر

سینہ فگار

سینہ ہمارا فگار دیکھیے کب تک رہے
چشم یہ خوننابہ بار دیکھیے کب تک رہے

ہم نے یہ مانا کہ یاس کفر سے کم تر نہیں
پھر بھی ترا انتظار دیکھیے کب تک رہے

اُمّتِ احمد کو ہے فضل کی تیرے اُمید
فضل کی امیدوار دیکھیے کب تک رہے

عشق سو وہ بھی ترا، صبر طلب ہے، بہت
صبر ہمارا شعار، دیکھیے کب تک رہے

سب کو یہاں ہے فنا ایک تجھے ہے بقا
یہ ستمِ روزگار دیکھیے کب تک رہے

حق کی کمک ایک دن آ ہی رہے گی ولے
گرد میں پنہاں سوار، دیکھئے کب تک رہے

یوں تو ہے ہر سو عیاں آمدِ فصلِ خزاں
جور و جفا کی بہار، دیکھئے کب تک رہے

دین پہ دنیا فدا، کرتے رہے مدّتوں
کفر پہ ایماں نثار، دیکھئے کب تک رہے

رونقِ دہلی پہ رشک تھا کبھی جنت کو بھی
یوں ہی یہ اجڑا دیار، دیکھئے کب تک رہے

پہلے رہا دردِ دل مونسِ جاں مدّتوں
دردِ جگر اب کی بار، دیکھئے کب تک رہے

زور کا پہلے ہی دن نشہ ہرن ہو گیا
زعم کا باقی خمار، دیکھئے کب تک رہے

ماتمِ شبیر ہے، آمدِ مہدی تلک
قوم ابھی سوگوار، دیکھئے کب تک رہے

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی

رئیس الاحرار
حضرت مولانا محمد علی رح

مولانا محمد علی ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے - آبائی وطن مراد آباد تھا - ان کے دادا علی بخش خاں اپنے وقت کے ایک بڑے آدمی تھے - نہایت عقل مند اور خوش حال تھے - ریاست رامپور میں انھیں ایک بہت اچھا عہدہ مل گیا تھا - وہ نواب یوسف علی خاں کے دستِ راست تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء میں انہوں نے بہت سے انگریزوں کی جانیں بچائیں، جس کے صلہ میں انھیں ضلع مراد آباد میں "خانی سمار" گاؤں جاگیر میں ملا، مولانا کے والد عبد العلی خاں بھی ریاست میں ایک بڑے عہدے پر مامور تھے - انہوں نے جوانی ہی میں انتقال کیا - اس وقت بی اماں کی عمر ۲۷ برس کی تھی - مولانا شوکت علی پانچ چھ برس کے تھے اور مولانا محمد علیؒ دو برس کے بچے تھے - بی اماں نے اپنے یتیم بچوں کی پرورش کی اور ایسی کی کہ پورا ہندوستان ان پر فخر کر رہا ہے

ابتدائی تعلیم بی اماں نے اپنے یتیموں کو تعلیم کے لئے علی گڑھ بھیج دیا - نہایت کامیابی سے یہاں تعلیم ختم کر کے مولانا مرحوم انگلستان کی آکسفورڈ یونیورسٹی میں تکمیل کے لئے تشریف لے گئے - ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۲ء تک پورے چار سال وہاں رہے - اور چونکہ قومی خدمت کا ولولہ اب پیدا ہو چکا تھا، اس لئے سول سروس کے امتحان میں پاس نہ ہو سکے۔ لیکن خدمتِ وطن و جہاد اسلام کے امتحان میں پوری طرح کامیاب ہو گئے ۔

بڑودے میں ملازمت انگلستان سے واپسی پر آپ ریاست رام پور کے محکمۂ تعلیم میں، پھر ریاست بڑودہ میں ملازم ہو گئے - اور اپنے فرائض نہایت دیانتداری و مستعدی

سے انجام دیئے، بہت سی اِصلاحات جاری کیں۔ مہاراجہ بڑودہ اُن کے بے حد مُعترف ہوئے اور ریاست کے غریب باشندے اب تک آپ کو شُکر گذاری سے یاد کرتے ہیں۔

کامریڈ کا اجراء لیکن ریاست میں مولانا جیسے مُجاہد کے لئے دائرۂ عمل بہت تنگ تھا۔ اُن کے حوصلوں کیلئے وسیع میدان کی ضرورت تھی۔ چنانچہ مُلازمت ترک کر دی اور جنوری ۱۹۱۱ء کو اسی کلکتہ سے اپنا شہرۂ آفاق غیر فانی انگریزی اخبار "کامریڈ" جاری کر دیا۔ جس کا بلند پایہ اب تک اخبار نویسی کی دُنیا میں مُسلّم ہے۔ آپ ہندوستان کے ایک مشہور ترین اور مُسلمانوں میں سب سے بڑے انگریزی اور اُردو انشاپرداز تھے۔

"مُسلم لیگ" اور "ہمدرد" ۱۹۰۶ء میں مولانا محمد علیؒ نے دوسرے رُفقاء کے ساتھ مِل کر مُسلم لیگ قائم کی اور مسلمانوں میں آزادی کی رُوح پیدا کرنے لگے۔ کامریڈ کے بعد آپ نے اُردو میں اپنا مشہور روزانہ اخبار "ہمدرد" نکالا۔

طبّی مِشن مسجدِ کانپور کے مشہور ایجی ٹیشن کے بعد مولانا نے جنگِ بلقان کے زمانہ میں ٹرکی کی عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ ڈاکٹر انصاری کے تحت ایک طبّی مشن وہاں بھیجا اور تمام دُنیائے اِسلام پر اپنی غیرتِ اسلامی کا سکّہ بٹھا دیا۔

عالم گیر جنگ عالم گیر جنگِ یُورپ نے مولانا کو انگریزی حکومت کے مُقابلہ پر کھلے بندوں کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا۔ "لنڈن ٹائمس" کے جواب میں اُنہوں نے "ٹرکی کا انتخاب" عُنوان دے کر کامریڈ میں ایک ایسا زبردست مضمون لکھا کہ پُورا برطانیہ چیخ اُٹھا اور تھوڑی مُدت بعد مئی ۱۹۱۵ء میں اُنھیں حکومت نے نظر بند کر دیا۔

رہائی ۲۵ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو وہ نظر بندی سے رہا کر دیئے گئے۔ کون مسلمان ہے جسے وہ جوش و خروش یاد نہ ہوگا جو آپ کی رہائی پر تمام ہندوستان میں عام ہو گیا تھا۔ امرتسر کانگریس کے اجلاس اِسی زمانہ میں ہو رہے تھے۔ پُوری کانگریس نے آپ کا ایسا استقبال کیا کہ ہمیشہ یاد رہے گا۔

تحریکِ خلافت اب تحریکِ خلافت شروع ہوتی ہے اور مولانا کی قیادت و زعامت کے آگے تمام مُلک جُھک جاتا ہے۔ اس تحریک کے سلسلہ میں آپ کے کارنامے

اتنے روشن ہیں کہ تاریخ انھیں کبھی بھول نہیں سکتی۔ ہندوستان کا بچہ بچہ ان سے واقف ہے۔ محمد علی، شوکت علی اور بی اماں کے کار ہائے نمایاں، ہندوستان سے لے کر اسلامی دنیا اور یورپ تک میں، سب سے خراجِ اعتراف وصول کر چکے ہیں۔ ہندوستان کا آسمان اور زمین ہمیشہ اِس زندگی کو مسرت سے یاد رکھیں گے، جو ان دونوں بھائیوں اور اُن کی بلکہ ہم سب کی بی اماں نے تمام مُلک کے مُردہ جسم میں اک رُوح پھونک دی تھی۔

سُنتِ یُوسفی نظر بندی کے مصائب اور جہادِ خلافت کے خطروں کے بعد اب سنتِ یُوسفی پُوری ہونے کا وقت آتا ہے۔ ہندوستان کا یہ یُوسفِ ثانی اپنے بھائی کے ساتھ قید خانہ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ مُجاہدِ حق پر کراچی میں مقدمہ چلایا جاتا ہے۔ اور اُنھیں دو سال کی سزا دی جاتی ہے۔ عدالت میں اُنھوں نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

"وہ ہم نہیں ہیں، جن کی عدالت میں آزمائش ہو رہی ہے، بلکہ وہ خود حکومت ہے، کیونکہ وہ خدا کے قانون سے بغاوت پر کمر بستہ ہو گئی ہے۔"

سوراج کی کُنجی جیل سے پُورے دو سال بعد رہا ہو کر مولانا نے پہلا اعلان یہ کیا کہ:

"میں سوراج کی کُنجی تلاش کروں گا، تاکہ یرودا جیل کا پھاٹک کھول دوں، جس میں ہندوستان کی رُوح (مہاتما گاندھی) مقیّد ہے۔"

کانگریس کی صدارت جیل سے آنے کے بعد آپ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر بنائے گئے۔ کانگریس کی صدارت ہی وہ زیادہ سے زیادہ معزز اور بڑا منصب ہے جو غلام ہندوستان اپنے کسی سپوت کے لئے پیش کر سکتا ہے۔ مولانا کو اپنی کانگریس کا صدر بنا کر ہندوستان نے تسلیم کر لیا کہ آپ اس کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ ایسے بادشاہ جس پہ ہزاروں تاجدار قُربان کر دیئے جا سکتے ہیں۔

مولانا کی شخصیت اللہ تعالیٰ نے مولانا مرحوم کو ایک ایسی شخصیت دی تھی جو اپنے اندر عجیب کردار اور جاذبیت رکھتی تھی۔ کتنا ہی مخالف ہو، سامنے آ کر ہتھیار ڈال دیتا۔ اور حلقۂ محبت میں گرفتار ہو جاتا تھا۔

جوشِ مذہبی مولانا اگرچہ انگریزی تعلیم یافتہ تھے۔ مگر جوشِ دینی اُن سے کبھی جدا نہیں ہوا۔ مذہبی فرائض کے ہمیشہ سے پابند تھے۔ نظر بندی کے زمانہ میں دینداری بہت بڑھ گئی تھی۔ عربی زبان پہلے سے کچھ کچھ جانتے تھے۔ اب اُس میں مزید استعداد پیدا کرلی۔ قرآن مجید اور کتبِ احادیث کا مطالعہ کیا اور اچھے خاصے عالمِ دین بن گئے۔ اِسی دینی جوش و قابلیت کا نتیجہ تھا کہ مولانا عبدالباری صاحب مرحوم فرنگی محل نے آپ کو "مولانا" کے لقب سے ملقب کیا۔ یہ لقب آپ کے لئے نہایت موزوں و مناسب تھا۔ ہندوستان میں کم ایسے مولوی ہوں گے جو مذہبی معاملات میں آپ سے زیادہ ہوں۔ ابتداء میں صُوفیانہ مشرب کی طرف زیادہ میلان تھا جو آخر تک کچھ نہ کچھ قائم رہا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ کتاب و سُنّت کی طرف رُجحان بڑھتا جاتا تھا۔ جیسا کہ اُن کی تقریر مراد آباد سے ظاہر ہے:

غالباً ۱۹۲۸ء میں مولانا نے کاتبِ حرُوف سے اُس کے مترجمہ امام ابنِ تیمیہ کے بعض رسائل اور کتابیں طلب کیں۔ اُس نے از راہِ مزاح عرض کی "آپ یہ لے کر کیا کریں گے، اُن میں وہابیت بھری ہوئی ہے۔ اور آپ صوفیانہ مشرب رکھتے ہیں۔"

فرمایا "میں دیکھنا چاہتا ہوں، وہابیت کس بلا کا نام ہے۔"

چنانچہ اس کے بعد ایک مرتبہ جب پھر ملاقات ہوئی تو فرمایا اور بہت جوش سے فرمایا "مجھے دھوکا دیا گیا تھا۔ واقعی ابن تیمیہ مجددِ اسلام ہے۔ اگر وہابیت وہی ہے، جو ابن تیمیہ نے لکھی ہے تو آج سے میں وہابی ہوں!"

کاتبِ سطور یہ الفاظ لکھ رہا ہے اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہیں، اس کی تحریریں مولانا کو بہت پسند تھیں۔ ایک مرتبہ کلکتہ تشریف لائے تو فرمایا "میں نے شملہ میں تیری کتاب "رحلتِ مُصطفےٰ" کا اشتہار پڑھا تھا۔ میں اُسے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

خاکسار نے عرض کیا "مگر یہ کتاب تو وہ ہے جس کی بابت خواجہ حسن نظامی نے

لکھا ہے کہ کسی مسلمان کے قلم سے ایسی مُلحدانہ کتاب نکل ہی نہیں سکتی۔ نیز عرض کیا کہ آپ کے ایک بڑے مُعتقد نے بھی اس پر بہت لے دے کی ہے۔ آپ کو کیوں کر پسند آئے گی؟

فرمایا "نہیں لاؤ" چنانچہ لے گئے اور جب پھر ایک دفعہ ملاقات ہوئی تو دیکھتے ہی سینہ سے لگا لیا اور فرمایا "ایسی کتاب آج تک لکھی نہیں گئی"۔ اتنی موثر ہے کہ روتے روتے میری ہچکی بندھ گئی تھی! میں خود اس کی اشاعت کروں گا"۔ چنانچہ "ہمدرد" کی زندگی بھر اُس کا اشتہار بالکل مُفت شائع کرتے رہے۔

زندہ دلی بے حد زندہ دل تھے۔ ہنستے رہتے اور ہنساتے رہتے تھے، جب جب کلکتہ تشریف لاتے تو مشہور مُغنّی پیارے صاحب کا گانا ضرور سُنتے۔ رات بھر مجلس گرم رہتی۔ راقم الحروف کو زبردستی ساتھ رکھتے اور ہرگز اُٹھنے نہ دیتے اور فرماتے "میں تمہاری وہابیت توڑنا چاہتا ہوں"۔

افسوس! صد ہزار افسوس!!

("پیام" کلکتہ وضمیمہ اخبارِ مدینہ
مورخہ ۲۵ر جنوری سنہ ۱۹۳۱ء)

مولانا راغب احسن

حضرت رئیس الاحرارؒ کی مجاہدانہ زندگی

نصب العین اسلامی کا دنیا میں زندہ جاوید مظہر

"پس محمد علی کمیونل ازم، نیشنل ازم اور پان اسلام ازم کا ایک نادر مجموعہ تھا۔ وہ ایک کمیونلسٹ (فرقہ پرست) کی حیثیت سے طلوع ہوا، ایک نیشنلسٹ (قوم پرست) اور انٹرنیشنلسٹ (بین الاقوامیت خواہ) کی حیثیت سے چمکا۔ اور ایک سچے پان اسلامیسٹ کی حیثیت سے غروب ہوا۔"

——— بی۔ اے۔ بھروچہ، ویکلی ہیرلڈ بمبئی، ۱۰ جنوری ۱۹۳۱ء

مذکور الصدر الفاظ میں پارسی مقالہ نگار نے مسٹر ہارنی مین کے اخبار میں مولانا محمد علی کی زندگی کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ مضمون بالا حضرت رئیس الاحرار کی زندگی کا ایک بالکل ناقص اور غیر مربوط خاکہ پیش کرتا ہے۔ میں اس مضمون میں اس غلط اور غیر منصفانہ بیان کی تردید کرنا اپنا فرض محسوس کرتا ہوں۔

ایمان اور اسلام سب سے نمایاں شے جو ہم کو مولانا محمد علی جوہر کی سیرت میں نظر آتی ہے، وہ آپ کا "ایمان" ہے۔ جن صاحبان کو حضرت مولانا سید شاہ محمد علی مونگیریؒ اور حضرت مولانا سید شاہ بدرالدینؒ اول امیرِ شریعت صوبہ بہار اڑیسہ جیسے اس صدی کے

خاصانِ خدا سے شرفِ نیاز حاصل رہا ہے، اُن کا بیان ہے کہ جس خوبی کے ساتھ یہ علی گڑھ اور آکسفورڈ کا گریجویٹ "یورپ زدہ" نفوس میں حقیقی ایمان اور عشقِ الٰہی کی روح اُتارا کرتا تھا، وہ اس صدی میں کسی کو حاصل نہیں ہوئی ہے۔ اُن کا چہرہ دیکھ کر لوگوں کے ایمان تازہ ہوتے تھے، اُن کی ایمانیت کا یہ معجزہ تھا کہ بڑے بڑے ملحدین، نیچری اور افرنجیت کے نشہ میں سرشار روحیں صرف اُن کی شخصیت اور نگاہ کے جادو سے مسحور ہو کر خدا پرستی اختیار کرتی تھیں۔ آج بھی اُن کے چہرۂ انور کی یاد اور اُن کی صحبت کا تصور ہمارے دلوں کو زندہ روحوں کو سرشار اور ایمان کو تازہ کر رہا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کی زندگی کی دوسری نمایاں خصوصیت "اسلام" ہے۔ ان کی زندگی ایک کامل "مسلم" کی زندگی تھی۔ آپ نے اپنے کو یکسر اللہ کی مرضی کے حوالے کر دیا تھا ؎

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

یہی آپ کی زندگی کی تفسیر ہے، آپ کی پبلک اور پرائیوٹ زندگی فی سبیل اللہ انسانیت اور وطن کی خدمت کے لئے وقف تھی۔ آپ کی شاعری اُسوۂ حسنیٰ پر مر مٹنے کی ایک تڑپ اور دُنیا کے لئے درسِ ایمان و اسلام ہے۔ آج کون ہے جو کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ اُسوۂ شہیدِ کربلا کا یہ عاشق اپنی دعاؤں میں کامیاب نہ ہوا ؎

تم یوں ہی سمجھنا کہ فنا میرے لئے ہے
پر غیب سے سامانِ بقا میرے لئے ہے
پیغام ملا تھا جو حسینؓ ابن علیؑ کو
خوش ہوں وہی پیغامِ قضا میرے لئے ہے
ہم کھو کے تیری راہ میں سب دولتِ دُنیا
سمجھے کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لئے ہے

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے
کیا ڈر ہے جو ہے ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے

خدا پرست مومن و مُسلم آپ کی اسی للہیت کا نتیجہ تھا کہ آپ میں بقول ایچ جی ویلز نپولین اعظم کا دل کام کر رہا تھا۔ جو خوف سے نا آشنا تھا۔ لیکن حق یہ ہے کہ آپ کی شجاعت ایک شہنشاہیت پسند فوجی جنرل کی عسکری شجاعت نہیں تھی بلکہ ایک کامل "مومن و مسلم" کی شجاعت تھی جو ہمیشہ حق و حریت کی حمایت میں صرف ہوتی تھی۔ پس اُن کے متعلق "فرقہ پرست" یا "قوّت پرست" اور "بین الاقوامیت پرست" کے الفاظ کہنا غلط ہے، کیوں کہ کمیونل ازم، نیشنل ازم، اور انٹرنیشنل ازم جیسے تمام الفاظ گمراہ کُن ہیں، اور وہ ان سب سے بالاتر تھے۔ وہ ایک "خدا پرست" مومن و مسلم کے سوا اور کچھ نہیں تھے۔ نہ اور کچھ ہونے کی اُن کو ضرورت تھی۔
"ایمان اللہ الواحد القہار" پر ایمان، مذہبِ اسلام کے نظامِ زندگی پر ایمان، اسلام کی روشن تقدیر پر ایمان، اور "دنیا کے اس آخری ملجا و ماویٰ پر ایمان ہی اُن کی زندگی کا سہارا، دل کی روشنی اور روح کا جوہر تھا اور اُنہوں نے مسلمانانِ عالم، انسانیت اور پیارے وطن ہندوستان کے لئے جو کچھ کیا، وہ ایک سچے مومن و مسلم ہی کی حیثیت سے کیا ہے۔ جو شخص ایک "مسلم" ہو جاتا ہے اور صبغۃ اللہ میں رنگین ہو جاتا ہے، اُسے کچھ بننے کی حاجت نہیں رہتی۔ وہ دُنیا میں بہترین صاحب البیت، بہترین ہمسایہ، بہترین شہری، بہترین مُحبِ وطن اور بہترین انسانیت دوست بن جاتا ہے، وہ جُغرافیے، جھنڈے اور وطن کے جنجالوں سے آزاد ہو کر انسانیت کی حقیقی فلاح کی خدمت کرتا ہے۔ محمد علی کی زندگی کا یہی نصب العین اور مذہب تھا۔ اور یہی اسلام کا نصب العین اور مذہب ہے۔ یہی دینِ قیّم ہے اور اسی کو صراط المستقیم کہا جاتا ہے۔ "کامریڈ" اور "ہمدرد" میں آپ نے بارہا اس کا اعلان کیا تھا، اگرچہ اس کی ضرورت نہیں تھی، کیوں کہ خود آپ کی ساری

زندگی اسلامی نصب العین کی بہترین تفسیر تھی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ آپ اس عہد میں دُنیا کے اندر نصب العینِ اسلامی کے زندہ جاوید مظہر اور جوانانِ اسلام کے لئے ایک عظیم الشان اُسوہ ہیں۔

حیاتِ زندگی پر ایک نظر

آل انڈیا مسلم لیگ کی تاسیس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تحریک، "کامریڈ" اور "ہمدرد" کے ذریعے سے مسلمانانِ ہند میں سیاسی بیداری کی تخلیق اور حمایتِ اسلام کے جُرم میں نظر بندی۔ آپ کی ۱۹۱۹ء سے قبل کی پبلک لائف کے عنوانات عمل ہیں۔ مسجد کانپور، اور طبی وفد ترکیہ بھی انہی میں شامل ہیں۔ منٹو مارلے ریفارم میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ نیابت کے حصول میں بھی آپ کا حصہ ہے، لیکن آپ کی مہتم بالشان اور زلزلہ انگیز پبلک لائف کی ابتداء ۱۹۱۹ء سے ہوتی ہے۔ داعیٔ حق بن کر انگلستان، فرانس اور اٹلی کے ایوانوں میں جاتے ہیں۔ پوپ اور پائیکار کو تسلیم حق پر مجبور کر لیتے ہیں لیکن لائیڈ جارج اور کرزن کی اسلام دشمنی کے باعث ناکام واپس آتے ہیں۔ اور ہندوستان میں سب سے اوّل تحریکِ عامہ جاری کرتے ہیں، جو اس کی تاریخ کو یکسر منقلب کر دیتی ہے۔ کراچی کے تاریخی مقدمہ اور اسارت کے بعد سارا مُلک حق و حُریت کی آواز سے تہ و بالا ہو جاتا ہے۔ اور انڈیا گورنمنٹ جس نے مطالباتِ خلافت کو ٹھکرا دیا تھا۔ اب مجبور ہوتی ہے کہ برٹش گورنمنٹ سے معاہدہ سیورے کی ترمیم اور مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کے لئے ایک خصوصی یاد داشت کے ذریعہ سے سفارش کرے۔ بیجاپور جیل سے جب دو سال کی قید سے رہا ہو کر آتے ہیں تو اعلان کرتے ہیں کہ:۔

"ایک چھوٹے جیل سے ایک بڑے جیل میں آ گیا ہوں۔"

لیکن افسوس کہ شُدھی اور سنگٹھن نے تحریکِ آزادی اور مُصطفیٰ کمال کی ڈکٹیٹر شپ نے خلافت کو برباد کر دیا۔ تاہم محمد علی نے ایک سچے "مومن اور مسلم" کی طرح جو مایوسی کو بے ایمانی تصور کرتا ہے، اور ہر حال میں راضی برضائے مولیٰ رہ کر جہادِ زندگی میں معروف رہتا ہے "حریت وطن" اور "استقرارِ خلافت"

کے مقاصد سے پھرنے سے انکار کردیا، اگرچہ جیل کے شدائد و مصائب نے اُنھیں زار اور نڈھال کردیا تھا اور قلب، مثانہ اور ذیابطیس کے امراض گھُن کی طرح اُن کو زندانِ فرنگ میں لگ گئے تھے۔ پھر بھی وہ ایک لمحہ کے لئے آرام سے نہیں بیٹھے۔ رام پُور سے بے وطن تو ہو ہی چکے تھے، پبلک اور پرائیوٹ مصیبتوں کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا۔ موتمرِ اسلامی مکّہ میں شریک ہوئے اور سُلطان بن سعود نے ملکیت اور جمہوریت کے سوال پر اختلاف رائے رکھتے ہوئے بھی موتمر کو ایک پائیدار اور مستقل انسٹی ٹیوشن بنانے کے لئے اعلیٰ قابلیت کے ساتھ کام کیا۔ ہندوستان واپس آکر اس کی شاخ بھی قائم کی۔ کعبۃ اللہ میں جو دُعا آپ نے غلافِ کعبہ کو تھام کر اور آنسوؤں کا سیلابِ عظیم بہا کر مانگی تھی، وہ آپ کے اسلامی نصب العین کو پُوری طرح ظاہر کرتے ہیں :-

۱۔ آپ نے سب سے اوّل اپنے پچھلے گناہوں کی معافی چاہی، اور راہِ اسلام میں جاں بحق ہونے کی دُعا کی۔

۲۔ اس بعد اپنے برادرِ اکبر مولانا ذوالفقار علی صاحب کی ہدایت یابی کی دُعا کی۔

۳۔ پھر آپ نے عزیز وطن ہندوستان کے اندر اور باہر کی غلامیوں سے آزاد ہونے اور ایک حقیقی دولتِ عامرہ بن جانے کی دُعا کی۔

۴۔ سب سے آخر میں "خلافتِ راشدہ" کے احیاء اور استقرار کی دُعا کی۔

تھی۔ لیکن آخر میں یہ بھی درگاہِ رب العزّت میں عرض کی کہ اگر تو متبادل پیش کرتا ہے تو میں راضی ہوں کہ تو مجھ کو جہنّم میں جھونک دے لیکن ہندوستان کو ضرور آزاد کردے۔ اور ہماری زندگی میں خلافتِ راشدہ کو ایک بار دُنیا میں پھر قائم کردے اور اس کو ساری انسانیت کے لئے ملجا اور ماویٰ بنا دے، یہی میری کمترین اور آخرین دُعا ہے۔

اُسوۂ حسنیٰ کی پیروی رہائی کے بعد مسیح الملک اور ڈاکٹر انصاری آپ کی صحت کی طرف سے پریشان تھے۔ اور برابر آرام لینے کی تاکید کر رہے تھے۔ لیکن مُلک و ملّت آرام سے محروم تھے۔ تو پھر مُلک و ملّت کا یہ سچّا عاشق کس طرح آرام سے بیٹھ سکتا تھا۔ مہاراجہ الور اور احباب کے اصرار سے آخر علاج کے لئے یُورپ جانے پر مجبور ہوئے۔ ابھی صحت دُرست ہی ہوئی تھی کہ ہندوستان میں "نہرو رپورٹ" کا فتنۂ عظیم برپا ہوا۔ اس مردُود اور منحوس رپورٹ نے مولانا محمّد علی کی صحت کی بربادی میں سب سے زیادہ حصّہ لیا۔ جب وہ جرمنی، ترکیہ، فلسطین اور سرزمینِ کربلا سے ہوتے ہوئے ہندوستان لوٹے تو اپنی ساری قوّت اس رپورٹ کی بربادی اور ہندو اجارہ داری، ہندو قوم پرستی اور ہندو کانگریس کے تار و پود بکھیرنے میں صَرف کردی۔ امراض تیزی اور شدّت کے ساتھ عود کر آئے۔ حتیٰ کہ کئی بار جان کے لالے پڑ گئے، بینائی قریباً بالکل جاتی رہی۔ پھر بھی اپنے بستر علالت سے اپیل پر اپیل مُلک و ملّت کے نام شائع کرتے رہے، جس حق و حریت کے مقصدِ مقدّس نے اُن کو کانگریس میں داخل کیا تھا، اسی مقصد نے اس کی گمراہی اور بے انصافی کی مُخالفت پر آپ کو آمادہ کیا۔ لاہور کانگریس کے موقع پر آپ نے ایک نہایت ہی دردناک اپیل ملک کے نام شائع کروائی۔ یہ تمام سَرگرمیاں اطبّا اور حُکما کی رائے کے خلاف جاری رہیں۔ حتیٰ کہ آپ شملہ میں مرتے مرتے بچے۔ لیکن اعلاء کلمۃ الحق کے لئے لندن جانے کے لئے تیار ہوئے۔ آخری بار جب علی گڑھ گئے تو ایک بُزرگ کو خیریت دریافت کرنے پر بڑی حسرت سے فرمایا:

"قبر کی تیاریاں کر رہا ہوں۔"

واقعہ یہ ہے کہ عمداً اُسوہ حسنیٰ کا یہ پیرو اور خلافتِ راشدہ کا یہ شیدا سالہا سال سے اپنی شہادت کی تیاریاں کر رہا تھا۔ بار بار اپنی تقریروں اور تحریروں میں اس کا اعلان بھی کر رہا تھا۔ اور حق یہ ہے کہ اس نے

شہید کربلا کی سُنّت اور اسلام کے حقیقی معنی اور نصب العین کو اپنی مجاہدانہ زندگی سے ایک بار اور زندہ کر دیا ہے ۔ کون ہے جس نے تاریخ حال اور ماضی میں اتنی شاندار موت حاصل کی ہے !

نصب العینِ اسلامی کا قابل ترین داعی

لیکن مولانا محمد علی جوہر فقط ایک مومن و مسلم اور مجاہد فی سبیل اللہ ہی نہیں تھے ۔ آپ اسلام کے نصب العین، اسلام کی تقدیر، اسلام کے نظامِ اجتماع، اسلام کے اصولِ زندگی اور اسلام کی روحانیات و اخلاقیات کے اعلیٰ مبصّر بھی تھے ۔ ان مضامین پر جو تحریریں اور تقریریں آپ کی یادگار ہیں، وہ نہ صرف اعلیٰ ترین فصاحت و بلاغت کے جوہر پارے ہیں ۔ بلکہ نصب العینِ اسلامی کی بہترین تفسیر ہیں ۔ میں اس مختصر سے مضمون کو آپ کے دو یادگار بیانات پر ختم کرتا ہوں ۔ آپ غیر فانی "کامریڈ" میں تحریر فرماتے ہیں :

"کیا تھا جوہر تمدّنِ اسلامی کا ؟ یہ آرٹ نہیں تھا، اگرچہ آرٹ تہذیب یونانی کی اساس تھا ۔ یہ مابعدالطبیعیات نہیں تھا، اگرچہ مابعدالطبیعیات ہندو تمدّن کی نیو مہیا کرتا تھا ۔ اور یہ پالیٹکس بھی نہیں تھا، اگرچہ پولیٹکس موجودہ یورپین سوسائٹی کی بنیاد ہے، یہ سوشل ایتھکس (اجتماعی اخلاقیات) تھا ۔ اسلام ایک مذہب تھا ۔ ایک راستہ اور نہ محض تفکّر ۔ نہ فقط کشورستانی انسانیت کا حقیقی مذہب ہو سکتا ہے ۔"

گول میز کانفرنس میں مولانا نے اسلامی نصب العین کی تشریح ان لفظوں میں فرمائی :

"یہ آپ کے مذہب کا غلط تصوّر ہے، اگر آپ سیاسیات کو اس سے خارج کر دیتے ہیں ۔ یہ (مذہب) کوئی وضعی عقیدہ نہیں ہے ۔ کوئی مجنونانہ جوش و خروش نہیں ہے ۔ کوئی رسم و رواج نہیں ہے، مذہب کے معنی میرے دماغ میں تفسیرِ حیات ہے ۔ میرے پاس ایک کلچر ہے ۔ ایک پالیٹی

(نظامِ اجتماع) ہے - زندگی کا ایک مطمعِ نظر ہے - ایک کامل مجموعہ اور
معجونِ مرکّب ہے، جس کا نام اسلام ہے، جہاں خدا حکم دیتا ہے،
وہاں میں اوّل درجہ میں مسلمان ہوں، دوم درجہ میں مسلمان ہوں، آخر
درجہ میں مسلمان ہوں، اور سوائے مسلمان کے کچھ نہیں ہوں۔ اگر آپ
مجھ سے چاہیں کہ میں آپ کے ایمپائر (سلطنت) یا آپ کی "نیشن" میں
اس مجموعہ اور معجونِ مرکّب کو اس پالیسی اور نظامِ اجتماع کو، اس
تہذیب اور کلچر کو، اور اس اخلاقیات کو، ترک کر کے داخل ہو جاؤں
تو میں ایسا نہیں کروں گا - میرا پہلا فرض میرے خالق کی طرف سے عائد
ہوتا ہے، نہ کہ ملکِ معظّم یا میرے رفیق ڈاکٹر منجی کی طرف سے -

لیکن جہاں ہندوستان کا تعلق ہو، جہاں ہندوستان کی آزادی
کا تعلق ہو، اور جہاں ہندوستان کی فلاح کا تعلق ہو تو وہاں میں اوّل
ہندوستانی ہوں، دوم ہندوستانی ہوں، آخر میں بھی ہندوستانی
ہوں اور سوائے ہندوستانی کے اور کچھ نہیں ہوں۔"

اسلامی سیاست کے اصول و مقدمات

مولانا محمد علی جوہر نے گول میز کانفرنس لندن کی اس تقریر میں جس کا
اقتباس اُوپر درج ہوا، مسلمانوں کی پوزیشن اور اسلام کے نصب العین پر ایک مستقل
خطبہ دینے کا بھی وعدہ کیا تھا - یہ اُمید کی جاتی تھی کہ مولانا سرزمینِ یورپ میں اسلام کے
"سوشیل اور پولیٹکل آئیڈیلس" پر اپنی اعلیٰ فصاحت و بلاغت کے ساتھ سب سے پہلے
صدائے حق بلند کرتے اور خود یورپ کو بتاتے کہ جس اجتماعی فلاح و نجاح اور صلح و سلام
کا وہ جویا ہے، وہ نہ یورپ کی سرمایہ دارانہ جمہوریت میں ممکن ہے اور نہ روس کی اشتراکیت
میں قابلِ حصول ہے - وہ تو فقط اسلام کے اس نظامِ اجتماع (پالیٹی — POLITY)
میں ممکن الحصول ہے، جس کا ایک روشن نمونہ خلافتِ راشدہ تھی - مولانا کی یہ آرزو
تھی کہ وہ اسلامی سیاست کے اصول و مقدمات اور اسلامی ریاست پر ایک زبردست

کتاب لکھیں۔ آپ نے اس کے خاکے بھی بنالئے تھے۔ مواد اور مسالہ بھی تیار ہو چکے تھے۔ صرف صحت اور فرصت درکار تھی اور آخر میں اپنے احباب کے اصرار سے عملی سیاست سے علیحدگی کا فیصلہ اور اس عظیم الشان تصنیف کی تکمیل کا ارادہ کرلیا تھا۔ افسوس کہ حسرت اُن کے ساتھ آج دفن ہو رہی ہے اور آج مسلمانوں میں اس کام کا کرنے والا ایمان وعمل اور علم وفضل کے ہر دو پہلوؤں کے لحاظ سے کوئی اُن کے مانند اہل دکھائی نہیں دیتا۔ کیا مسلمان کم سے کم اُن کے ملفوظات کی تالیف ہی کی طرف متوجہ نہ ہوں گے؟ اور نصب العینِ اسلامی کی اشاعت کے لئے اُس کے سب سے بڑے داعی کی دعوت کی حفاظت کا انتظام نہ کریں گے؟ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے بعد یہ اُن کی بڑی رُوحانی اولاد ہے مسلمانوں کا فرض ہے کہ دونوں کی حفاظت و ترقی سے غافل نہ ہوں۔

(انقلاب، ۲۵ر جنوری ۱۹۳۱ء)

حد ہے پستی کی کہ پستی کو بلندی جانا
اب بھی احساس ہو اس کا تو اُبھرنا ہے یہی

تجھ سے کیا صبح تلک ساتھ نبھے گا اے عمر
شب فرقت کی جو گھڑیوں سے گذرنا ہے یہی

ہو نہ مایوس کہ ہے فتح کی تقریب شکست
قلبِ مومن کا مری جان نکھرنا ہے یہی

نقد جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہرؔ
کام کرنے کا یہی ہے تمہیں کرنا ہے یہی

جوہرؔ

علامہ نیاز فتح پوری

خلوص و صداقت کا مجسّمہ

جنوری کا "نگار" شائع ہو چکا تھا کہ مولانا محمّد علی کے واقعۂ ارتحال کی خبر ہندوستان آئی صبح کا وقت تھا میں بیٹھا ہوا بعض ضروری خطوط کا جواب لکھ رہا تھا کہ میرے کانوں میں یہ صدا آئی اور میں وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ مولانا محمّد علی کیا چیز تھے، کن خصوصیات کے حامل تھے۔ انھوں نے ملک و قوم کی کسقدر گرانمایہ خدمات انجام دیں، ان سب کا علم، اخبارات کے ذریعے اُن لوگوں کو بھی ہو چکا ہے جو اُن سے واقف نہ تھے۔ اس لئے اسکا اعادہ و تکرار مناسب نہیں سمجھتا اور یہ سطریں محض صدمہ کے اظہار میں لکھ رہا ہوں جو اس فقدان عظیم کی وجہ سے نہ صرف اسلامی ہند بلکہ سارے ہندوستان کو پہنچا ہے۔ مولانا محمّد علی کی صحافی و رہنمایانہ زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا جسے ہندوستانی سیاسیات کے تار و پود سے علیحدہ کیا سکے۔ وہ ایثار و قربانی، حرّیتِ رائے، آزادیٔ فکر، قوت عمل اور حبّ قوم کا مجسّمہ تھے اور حقیقت یہ ہے کہ اِس سے زیادہ ثبوت اُن کی وطن پرستی کا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اسی جذبہ کے تحت آخر کار انھوں نے جان ہی دیدی۔

اس میں شک نہیں کہ ہمیں ان کے بعض اصولِ کار سے اختلاف تھا اور ہم کو یقین ہے کہ اگر وہ اپنی بعض کمزوریوں کی وجہ سے (جن سے کوئی انسان خالی نہیں) اپنے جادۂ اوّلین سے انحراف نہ کرتے تو وہ ملک و قوم کے لئے زیادہ مفید ہوتے۔ لیکن ان کے خلوص و صداقت کو ایک لمحہ کے لئے مشتبہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اور اس لئے اگر اُن سے کوئی غلطی بھی ہوئی ہو

تو ایک مجتہد کی غلطی کی طرح ثواب سے خالی نہیں۔

مولانا مرحوم کی صحت و تندرستی ایک زمانے سے خراب تھی اور ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ موت سے قریب تر ہوتے جارہے ہیں لیکن اُن کے مردانہ عزائم اور دلیرانہ جوشِ عمل میں کبھی کوئی لغزش پیدا نہیں ہوئی اور اپنی صحت و توانائی یا راحت و آسائش کی طرف فرض کی حد تک بھی کبھی توجہ نہیں ہوئی اس لئے اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ وہ مسلمانوں کی جماعت میں گلِ سرسبد کی حیثیت رکھتے تھے تو غالباً بے جا نہ ہوگا اور اس لئے ہندوستان اس فقدان کے ساتھ اس صدمہ کو کبھی برداشت نہیں کرسکتا کہ وطن پر فدا ہو جانے والی ہستی کی خاک سے بھی وطن کو محروم رکھا گیا۔ یہ درست ہے کہ اعتقادی نقطۂ نظر سے بیت المقدس ان کے لئے بہترین آرام گاہ ہے لیکن ہمیں اس کے ماننے میں تامّل ہے کہ خود انھوں نے وصیت کی تھی۔ یا تو ان کو وہیں یورپ میں دفن ہونا چاہیئے تھا۔ تاکہ وہاں آزادیٔ ہند کی ایک یادگار قائم ہوتی یا پھر آغوشِ ہند میں ان کی مٹی کو سپرد کرنا چاہیئے تھا جس کے لئے انھوں نے جان دی۔

خیر وہ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کونسی یادگار ہوسکتی ہے جس کو صحیح معنی میں مرحوم سے منسوب کیا جاسکے۔ اور اس کے قیام کے لئے ملک کس حد تک تیار ہے۔ ابھی تک اجتماعی حیثیت سے کوئی فیصلہ اس امر کا نہیں کیا گیا اور اس کے لئے ابھی رائے زنی کا وقت نہیں ہے۔ لیکن جہاں تک ہماری خواہش کا تعلق ہے، ہم اس یادگار کا قیام مادّی و روحانی دونوں طریق پر دیکھنا چاہتے ہیں روحانی سے مراد کسی ایسی تحریک کی تاسیس سے ہے جو تربیت عقول واذہان کے لحاظ سے مرحوم کے مقصدِ زندگی کو پورا کرنے والی ہو اور مادّی سے مقصود کوئی ایسی تعمیر ہے جو بصیرت کے علاوہ بصارتِ انسانی کو اُن کی یاد دلاتی

رہے ۔امرِ اوّل کے لئے بہترین طریقہ یہ ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے متعلق ایک کلیہ (فیکلٹی) محمد علی کے نام سے قائم کیا جائے اور امر دوم کی نسبت میری رائے یہ ہے کہ اس کلیہ میں مرحوم کا ایک مجسمہ قائم کیا جائے ۔ ۔ ۔ ۔ جامعہ ملیہ والے تو غالباً اس کو بخوشی قبول کرلیں گے لیکن مولویوں کی طرف سے ضرور اندیشہ ہے کہ شاید وہ مجسمہ کے قیام کو جائز نہ سمجھیں، بہرحال قیام یادگار کی جو صورت بھی تجویز کی جائے اس میں دونوں پہلوؤں کا لحاظ ہمارے نزدیک ضروری ہے ۔اس طرح نہ سہی کسی اور طرح سہی ۔

("نگار" فروری ۱۹۳۱ء)

کبھی چکھے ہی نہیں آبلہ پائی کے مزے
خضر کیا جانے بھلا راہنمائی کے مزے

کثرتِ شوق میں تھا ہجر میں رنگِ وصال
ہم نے لوٹے ہیں بہت تیری جدائی کے مزے

طبع آزاد اسیری میں بھی پابند نہ تھی
قید میں ہم نے اٹھائے ہیں رہائی کے مزے

میری مرضی ہوئی گم جب سے تری مرضی میں
بندگی میں ملے ساری خدائی کے مزے

کثرتِ شوق بھی اور لذتِ بُعدِ منزل
ہر طرف خارِ تھے اور آبلہ پائی کے مزے

(جوہر)

محمد شریف سیپنی

سرسیّد اور جمال الدین افغانی کا مجموعہ
رئیس الاحرار کے اوصاف کی جمعیّت

کسی سے پوشیدہ نہیں کہ سرسیّد احمد خاں اور سیّد جمال الدین افغانی مرحوم عالمِ اسلام کی وہ مایۂ ناز ہستیاں ہیں کہ مسلمانانِ ہند اول الذکر پر اور تمام عالمِ اسلام موخرالذکر پر جتنا فخر کریں بجا ہے۔ لیکن رئیس الاحرار مولانا محمّد علی کے جنّت نشیں ہوجانے سے ملّتِ اسلامیہ کی ایک ایسی گرانقدر شخصیت چھن گئی ہے جو سرسیّد احمد خاں اور سیّد جمال الدین دونوں کے صفاتِ حُسنہ کا کامل مجموعہ تھی۔ اور وقت کے لحاظ سے انفرادی حیثیت سے ان پر بھی ایک محاسن فوقیت رکھتی تھی۔

عام طور پر مولانا مرحوم کی زندگی مقاصد کے لحاظ سے دو حصّوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔ ایک مقصد ہندوستانیوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنا۔ اور دوسرا جمیع مسلمانانِ عالم میں اتحادِ ملّیہ کا بیج بونا تھا۔ طوالت کے خوف سے ہم مضمون کو صرف ملّتِ اسلامیہ تک ہی محدود رکھتے ہیں۔

سیاسی اصلاح کا علم بردار اگرچہ مولانا محمّد علی اور سرسیّد احمد مرحوم میں خیالات کے لحاظ سے بعض مقامات پر موازانہ غیر موزوں ہے لیکن عملی طور پر جس طرح سلطنتِ مُغلیہ کے زوال اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد مسلمانوں کی تمام کمزوریوں کی بنا فقدان تعلیم کو قرار دے کر اس کے حصول کے اسباب مہیا کرنے کے لئے سرسیّد احمد مرحوم سے خوفِ ناامیدی کو دل سے نکال کر خود بخود مردانہ وار

مسلمانانِ ہند کی قیادت اختیار کر لی تھی، اور اپنی تمام زندگی کو انھیں کے مفاد کے لئے وقف کر دیا تھا، اس طرح مولانا مرحوم نے بھی مسلمانوں کی سیاسی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے ایک اعلیٰ افسر کی پُرسکون اور تسلّی بخش زندگی کو جاں فشانی کی زندگی میں تبدیل کر لیا اور مسلمانوں کی زندگی کو ہر ایک شعبے میں کامیاب بنانے کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک گرا دینے سے گریز نہ کیا۔

قربانی کا معلّم اگر سر سید نے علی گڑھ کالج کے قیام سے نوجوان مسلمانانِ ہند کے لئے ایک جگہ جمع ہو کر تبادلۂ خیالات سے عین اسلامی فضا میں پھلنے پھُولنے، تعلیم حاصل کرنے اور اسلامی اصول پہ زندگی بسر کرنے کے اسباب مہیّا کر دیئے تو مولانا نے عام مسلمانوں میں ایسی عملی رُوح پھُونک دی جس کے لئے نہ صرف مسلمانانِ ہند بلکہ تمام ہندوستان ہمیشہ کے لئے ان کا مرہونِ منّت رہے گا۔ اور یہ انھیں کی علمی اور عملی تعلیم کا نتیجہ ہے، اور آئندہ یہی ہوگا کہ مسلمان نہ صرف اسلام کی خاطر جان لڑا دینے کے لئے ہر وقت مستعد ہیں بلکہ مادرِ وطن کی آزادی کے لئے بھی پھانسی کے رسّے کو بخوشی بوسہ دینے کے لئے تیار ہیں۔ مسلمانوں میں آج جس قدر سیاسی بیداری موجود ہے، یہ مولانا ہی کے فیض کا نتیجہ ہے۔ اور مولانا کی وہ جسارت اور مردانگی جس کا وہ آج سے برسوں پہلے کلمۃ الحق کے بلند کرنے میں مظاہرہ کر چکے ہیں، ہم سب کے لئے شمعِ ہدایت کا کام دے گی۔

مُسلم یونیورسٹی کی خدمت جب کہ مُسلم یونیورسٹی اپنی اندرونی بے شمار کمزوریوں کے سبب تباہ ہو رہی تھی، اور مولانا ابو الکلام آزاد اور دوسرے سرکردہ مسلمان اس کے بند کرانے کے مشورے دے رہے تھے تو اس وقت مولانا محمد علی ہی کی دُور اندیش اور صائب رائے اس مریض کی بیماریوں کی تشخیص کے لئے ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کرنے کا فیصلہ

کیا تھا۔ جس کے سبب سے وہی یونیورسٹی آج تک بکمال خوبی اپنے مشن کو پورا کررہی ہے۔ اگر سر سید احمد نے سب سے پہلے مسلم یونیورسٹی کی بنا رکھی تو اس کے دوسرے بانی ہونے کا سہرا مولانا محمدؔ علی ہی کے سَر ہے۔

مصائب کی برداشت سَر سید احمد کو اپنے مقصد کے حصول کے لئے بے انتہا مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ جن سے آج ہر ایک کلمہ گو بخوبی واقف ہے۔ اسی طرح مولانا نے مسلمانوں کی خدمت کرنے اور اپنے مشن کا کام چلائے رکھنے میں ایسی تکلیف کو لبیک کہا جن کے تخیل ہی سے اسلامیت کے بڑے بڑے حامی معابد کے گوشوں میں پناہ گزیں ہوتے تھے۔ جب کبھی مسلمانوں پر کوئی بجلی گری تو اس کو سب سے پہلے اسی ایک شخص نے اپنے دامن میں لیا۔ اور حق و صداقت کی آواز کو بلند کرنے میں شدید سے شدید مخالفت کی ذرہ بھر پروا نہ کرتے ہوئے، جان سی عزیز شے کو نثار کر دینے کے لئے تیار ہوا۔ سَر سید احمد نے اگر گلی گلی اور کوچے کوچے پھر کر یونیورسٹی کے قیام کے لئے چندہ جمع کیا، تو مولانا نے بھی گھر گھر پھر کر انگورہ کے مسلمانوں کے لئے چندہ جمع کیا۔ سَر سید احمد کے خاندان میں سے کسی عورت نے میدانِ عمل میں اُن کا ساتھ نہیں دیا۔ لیکن مولانا کا سارا خاندان ان کی تعلیم کی وجہ سے ان کے ساتھ سرگرم کار تھا۔ مولانا نے تحفّظِ حقوق مسلمین کے سلسلہ میں خواہ وہ کسی رنگ میں ہو، خود مسلمانوں سے گالیاں کھائیں۔ سَر پر اینٹوں کی بوچھاڑیں برداشت کیں۔ لیکن اپنے اعلیٰ مقصد سے ہرگز قدم نہ ہٹایا۔ ہر گالی پر سَر سید کی طرح آپ کا دِل بڑھتا تھا۔ ہر پتھر پر آپ کے خلوص میں اضافہ ہوتا تھا۔

علم و عمل کا تاجدار اگرچہ خود سَر سید کے بنائے ہوئے تھے، لیکن اکثر معاملات میں ان سے سبقت لے گئے۔ سَر سید اپنے ساتھیوں کو اپنے رنگ میں اتنا نہ رنگ سکے، جتنا مولانا مرحوم۔ سَر سید احمد مرحوم اپنی تمام زندگی میں اتنے معاون پیدا نہ کر سکے، جتنے مولانا اپنی زندگی کے درمیانی حصّے تک کر سکے۔ مولانا کی ایک آواز پر ہندوستان کے مختلف گوشوں سے ہزاروں نوجوان مُلک و ملّت پہ جاں نثاری کے لئے سَر

ہتھیلیوں پر لے کر نکل آتے تھے۔

سَر سید نے اسلامیانِ ہند میں علمی ترقی پیدا کی، لیکن مولانا نے اس علم کے ساتھ عمل کو بھی شامل کر دیا۔ جس کے بغیر علم بے معنی ہے اور مسلمانوں کے سینوں کو جذبات سے لبریز کر دیا۔ جس کی تصدیق وقت کر چکا ہے۔ اور آیندہ بھی وقت ہی کرے گا۔ پُرانے رہنماؤں کے علاوہ جو رہنما اس وقت میدانِ عمل میں ہیں، یا جو نئے پیدا ہوں گے۔ وہ یقیناً مولانا ہی کے چشمۂ فیض کے جرعہ نوش ہوں گے۔

قیادت کی ہمہ گیری سَر سیّد احمد اپنے وقت کے قایدِ اعظم نہیں مانے جاتے تھے۔ لیکن مولانا نے اگر بنگال میں تقریر کی تو وہ سرحدی مسلمانوں کے دلوں کو تڑپا گئی۔ جس مجلس میں گئے، اس پر چھا گئے۔ اور اگرچہ سَر سید احمد کو بعض مُفتیانِ اسلام کافر قرار دیتے تھے، لیکن مولانا کی شخصیت کے آگے سب۔۔۔ جُھک گئے۔ اور اس انگریز خواں کے اسلامی خیالات کو سُن کر اُن کے قلوب راحت پاتے تھے۔

عُمر کے آخری حصّے میں سَر سید کی طبیعت چِڑ چِڑی ہو گئی تھی اور آپ یونیورسٹی کورٹ کے جلسوں میں بعض اوقات درشت الفاظ کہہ جاتے تھے۔ اسی طرح مولانا میں بھی اُن کی عُمر کے آخری حصّے میں کئی وجوہ سے یہی حالت پیدا ہو گئی تھی۔ انسان کے محاسن کے ساتھ بعض معائب کا ہونا عام انسانی فطرت ہے۔

سید جمال الدین افغانی اب ہمیں مولانا کی زندگی کے اس پہلو پر روشنی ڈالنا ہے، جس کا تعلق بیرونِ ہند اور خاص کر اسلامی ممالک سے ہے۔ سید جمال الدین افغانی غالباً خلفائے راشدین کے بعد سب سے پہلے مسلمان ہیں، جنہوں نے مسلمانانِ عالم کو فریضۂ حج کے فلسفہ کا عملی درس دینے میں انتہائی کوشش کی۔ اور اس کے لئے اُنہوں نے ہندوستان، افغانستان، ایران، عرب، مصر، فرانس، انگلینڈ اور روس وغیرہ میں کئی ایک دورے کئے۔ اور اپنی مختصر سی زندگی میں اسی دُھن میں لگے رہے کہ کسی نہ کسی طرح "اتحادِ اسلام" کی بنا ڈال سکیں۔ اور اس کے لئے اُنھیں مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ اسی طرح مولانا مرحوم کو ہندوستان اور ہندوستان کے

مسلمانوں کی بہبود کے ساتھ ہی ساتھ "اتحادِ اسلام" قائم کرنے کی خواہش تھی اور اس کے لئے انہوں نے سرسیّد سے زیادہ مصائب برداشت کیں۔ اگر بم ٹرکی پر گرے تو دھواں مولانا کے دل سے اٹھا۔ گولیاں فلسطین کے مسلمانوں پر چلیں تو سینۂ مولانا کا چھلنی ہوا۔ نرغہ میں مراکش کے مسلمان آئے تو خون مولانا کا کھولنے لگا۔ انگریزی جہاز نے مصر کا رُخ کیا تو جنگ کے لئے مولانا تیار ہو گئے۔ اگر پھانسی پر دمشق کے مسلمان چڑھائے گئے تو کلمۂ شہادت مولانا کے لبوں پر جاری ہوا۔ ایران اور افغانستان کے حال پر آنسو مولانا کی آنکھوں سے بہے۔ گویا کہ تمام عالمِ اسلام کی رُوح محمد علی کی شخصیت میں اس غلام آباد اور ظلمت کدہ میں موجود تھی۔

دوگانہ مقاصد لیکن سیّد صاحب اور ان کے مقصد میں یہ فرق تھا کہ اوّل الذکر صرف اتحادِ اسلام کے حامی تھے، لیکن مولانا "اتحادِ اسلام" کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی مُخلصی کے بھی خواہاں تھے۔ سیّد صاحب صرف عالمِ اسلام کو اہلِ یُورپ کے خلاف کمربستہ دیکھنے کے متمنّی تھے۔ لیکن مولانا کا یہ بھی مقصد تھا کہ اس کے دباؤ سے ہندوستان پر انگریزیت کا ہاتھ کمزور ہو، اور یہ بالکل صحیح ہے کہ جب بھی اسلامی سلطنتوں کی برطانیہ سے مُڈبھیڑ ہوئی تو ہندوستان پر انگریزوں کا ہاتھ کمزور ہوگیا۔ جس کو پختہ کرنے کے لئے وہ اس وقت اس سے بہتر سلوک کرنے لگے۔ ۱۹۱۹ء کی افغانستان کی لڑائی اس کی شاہد ہے جب کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر مسجدوں کے قُفل کُھلوائے گئے تھے۔ اور مارشل لاء ہٹالیا گیا تھا۔ سیّد صاحب بالکل نیشلزم کے حامی تھے، کیوں کہ ان کے کام کا مرکز ایسا تھا، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے لیکن مولانا قومیت پرست ہونے کے علاوہ ہندوستان میں مسلمانوں کے خاص طور پر محافظ تھے۔ ان کا نیشلزم اور کمیونزم ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ لیکن اس صورت میں کہ ایک کو دوسرے سے نقصان نہ پہنچے۔

دائمی اتحادِ ایشیا اس کے علاوہ مولانا اتحادِ ایشیا کے بھی بڑے حامی تھے۔ اور اس کو بھی ہندوستان کے استخلاص کا ذریعہ یقین کرتے تھے۔ آنجہانی مسٹر سی آر داس اس میں ان کے زبردست ہم خیال تھے، اور اگر وہ کچھ عرصہ اور زندہ رہتے تو یہ تحریک بہت کامیاب ہوتی؛ لیکن مولانا کے اکیلے رہ جانے اور ان کی صحت خراب ہو جانے کی وجہ سے اس کی اشاعت نہ ہو سکی۔ مولانا اس تحریک کے اس درجہ حامی تھے کہ آپ نے ۱۹۲۳ء میں کوکناڈا میں کانگرس کے صدر کی حیثیت سے چینیوں کو ہمدردی کا تار ارسال کرنے کا ریزولیشن پاس کرایا جو اس وقت برطانیہ سے برسرِ جنگ تھے، اس لحاظ سے سیّد صاحب کے سامنے صرف ایک ہی کام تھا لیکن مولانا کے سامنے تین بڑے اہم مسائل کا حل کرنا تھا۔

نظر بندی "اتحادِ اسلام" سے خائف ہو کر ۱۸۸۲ء میں مصر پر انگریزی فوج کشی کیے جانے سے پیشتر حکومتِ ہند نے سیّد صاحب کو جو اس وقت ہندوستان ہی میں تھے، دکن سے حکومت کے پایۂ تخت کلکتہ میں بلا لیا۔ اور وہاں اس شورش کے فرو ہو جانے تک ان کو نظر بند رکھا۔ مولانا مرحوم کو بھی اکتوبر ۱۹۱۴ء میں جنگِ یورپ میں "اتحادِ اسلام" کے اثرات سے خائف ہو کر مولانا شوکت علی کے ساتھ مہرولی میں نظر بند کر دیا گیا۔ وہاں سے پھر چھنڈواڑہ اور پھر ۔۔۔ میں بھیجے گئے۔ اور جنگ کے بڑھ جانے سے پھر دونوں کو ۔۔۔ جیل میں بغیر مقدمہ کے قید رکھا۔ جہاں سے آپ ۱۹۱۹ء میں رہا ہوئے۔

بے غرضی اور راست گوئی سیّد صاحب بڑے بے خوف اور راست گو تھے۔ انہوں نے ناصر الدین شاہ قاچار، کجکلاہِ ایران کے روبرو کہہ دیا کہ "تو سلطنت کے قابل نہیں، تخت سے علیحدہ ہو جا" اس کی پاداش میں اُنھیں سخت تکلیف دی گئی۔ مولانا نے بھی جب غازی کمال پاشا کو اسلامیت سے گریز کرتے دیکھا، تو اس کو صاف صاف اس سے منع کیا اور مؤتمر میں سلطان ابن سعود کو "اتحادِ اسلام" کے خلاف عمل پیرا ہوتے دیکھ کر آپ نے اُنھیں عقبہ اور

معآن انگریزوں کے جو کہ کر دینے سے روکا[۱] دونوں جابر سے جابر طاقت کے آگے بھی جھکنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اور ہمیشہ خدا اور اس کے رسول کی پیروی میں راست گوئی کو اپنا مسلک قرار دیلیتے تھے۔ سیّد صاحب نے لندن سے ایک انگریزی اور عربی اخبار "ضیاء ۔ ۔ ۔" جاری کیا۔ اور اس میں چند علماء کے نام ایک خط لکھا' جس میں شاہ ناصر الدین کو تخت سے اُتار دینے کی تجویز کی۔ اس سے پہلے آپ کا ایک اخبار "العروۃ الوثقیٰ" فرانس سے بھی نکلا تھا۔ اس طرح مولانا نے اپنے اخبارات "کامریڈ" اور "ہمدرد" کی وساطت سے بغیر خوف وہراس اپنے سچے اور پاکیزہ خیالات کا ہر شخص کے متعلق اظہار کیا۔ اور برطانیہ کے ایوان میں بھی اپنے آخری وقت میں ان کے تمام مدبروں کے سامنے ان کے نام لے لے کر مخاطب کرتے ہوئے کلمۃ الحق بلند کیا۔

شخصیت کا رُعب وداب سیّد صاحب کی شخصیت اسی قدر با اثر تھی اور حکومتِ برطانیہ صرف انھیں کے وجود کے سبب اسلامیوں سے اس درجہ خائف تھی کہ ۱۸۸۵ء میں اس نے انھیں پیرس سے لندن آنے کی دعوت دی تھی۔ تاکہ مسٹر چرچل کے ساتھ جو اس وقت وزیرِ ہند مقرر ہوئے تھے' عالمِ اسلام اور انگلستان کے مابین اتحاد کی گفتگو کریں۔ چنانچہ یہ وہاں گئے اور فیصلہ یہ ہوا کہ سلطان المعظّم کے سامنے مصر کے متعلق ایسی قرار داد پیش کریں کہ جس سے سلطنتِ عثمانیہ کو بھی تسلّی ہو جائے' اور مصر کا بھی کچھ فیصلہ ہو جائے۔ عین اسی طرح آج مولانا بھی اپنے عالم گیر اقتدار کے سبب لندن میں بُلائے گئے۔ تاکہ انگریزوں' ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہندوستان کے متعلق کچھ فیصلہ کریں جو کام انھوں نے باحسن طریق سرانجام دیا۔

---

[۱] سلطان ابن سعود نے کبھی عقبہ اور معان انگریزوں کے حوالے کرنے کا خیال ظاہر نہیں کیا اور دونوں علاقے سلطان کے حجاز پر پُورے طور پر قابض ہونے سے پیشتر شریفی خاندان کے ذریعہ سے انگریزوں کے قبضے میں جا چکے تھے ـــــ (انقلاب)

دونوں اکثر اسلامی ممالک میں اتحاد قائم کرنے میں کامیاب ہوئے، اور مولانا نے تو فلسطین میں اپنی آخری آرام گاہ کی وصیت کر کے فلسطین اور ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک مُحکم رشتۂ اتحاد پیدا کر دیا۔ اگر سیّد صاحب کے ذریعہ سے مصر میں حُبّ الوطنی اور مذہبی اتحاد کے جذبات پھیلے تو مولانا کی ذاتِ گرامی سے ہندوستان میں ایسے جذبات موجزن ہوئے۔

تعلّی اور زود رنجی سیّد صاحب میں تعلّی کی عادت تھی، زود خشم تھے، اپنے ذہن میں جس چیز کو حق خیال کرتے تھے، اس کو کُھلّم کُھلّا اور بے محابا بیان کرتے، کسی چیز سے متاثر ہو کر میدانِ عمل سے نہیں ہٹتے تھے۔ مُحتاط نہ تھے، اس لئے جہاں گئے لوگوں کو اپنا حاسد بنا لیا۔ تحریر و تقریر زبردست تھی۔ مولانا میں ان کی سب صفات موجود تھیں۔ مدبّر اور ہر دل عزیز بھی تھے، لیکن معائب میں قدرے فرق ہے، مولانا زود خشم بے شک تھے، لیکن تعلّی کی انھیں ہرگز عادت نہ تھی۔ زود خشم بھی عُمر کے آخری حصّے میں ہوئے، اور وہ شاید بیماری کی وجہ سے اس جوش پر قابو کھو دینے کے سبب، بے شک ان کی ماضی قریب کی تحریروں اور تقریروں میں اپنی خدمات کا ذکر زیادہ ہے۔ لیکن تعلّی کے سبب سے نہیں، وہ عین مواقع کے مطابق تھا، جس کو ہم سب آج محسوس کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی زندگی ہزاروں اہم واقعات سے بھری پڑی ہے۔ جن کا دُہرانا حقائق پر مبنی ہے۔

(روزنامہ انقلاب ۲۵ جنوری ۱۹۳۱ء)

نوری

مولانا محمد علی گول میز کانفرنس میں کیوں شریک ہوئے

راقم الحروف نے مولانا سے ایک پرائیوٹ صحبت میں پوچھا کہ کیا آپ کو یقین ہے کہ گول میز کانفرنس آپ کے مطمع نظر کو پورا کر دے گی؟

اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا تھا کہ میں اس شخص کو عقل مند نہیں سمجھتا جو اس اصول پر عامل نہ ہو کر جو کچھ اُسے آسانی سے مل رہا ہو، اس کو لینے سے انکار کر دے اور صرف اپنے مطمع نظر کو پیش نظر رکھے۔ میرا مطمع نظر آزادیٔ کامل ہے۔ لیکن اگر مجھے کوئی ایسی چیز حاصل ہوتی ہو جو کم از کم آزادی کامل کے حصول میں مدد دے سکتی ہو، تو میں ایک ہاتھ سے اس کو لے کر جیب میں رکھ لوں گا اور دوسرا ہاتھ میز پر مار مار کر مطالبہ کروں گا کہ میرا سوال پورا نہیں ہوا۔

ایک اور سوال کے جواب میں مولانا نے فرمایا تھا کہ میں تین وجوہ سے گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کا قصد رکھتا ہوں:

۱۔ اوّل تو اس وجہ سے کہ مجھے اُمید ہے کہ گول میز کانفرنس سے ہندوستان کو ایسی اصلاحات ملیں گی جن سے ہندوستان بیس سال کے اندر آزادیٔ کامل حاصل کرنے کی طاقت حاصل کر لے گا۔ اگر اس قسم کی اصلاحات حاصل ہو گئیں تو میں سمجھوں گا کہ گول میز کانفرنس کامیاب ہو گئی۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ گول میز کانفرنس کے انعقاد تک یا اس کے اندر میں فرقہ وارانہ مفاہمت کی کوشش کروں گا۔ اور چاہوں گا کہ مسلمانوں کے جائز اور معقول مطالبات آئینی طور پر تسلیم کر لئے جائیں۔ اگر اس میں کامیابی ہو گئی تو آزادیِ کامل کی منزل تک پہنچنے کے لئے سب سے پہلا شخص میں ہوں گا جو مسلمانوں کو اور مسلمانوں کے ساتھ اپنے آپ کو جنگِ آزادی میں جو دس سال کے اندر ہونے والی ہے، آگے آگے لے جاؤں گا اور مجھے یقین ہے کہ اگر فرقہ وارانہ مسئلہ قابلِ اطمینان طریق پر طے ہو گیا تو مسلمانوں کے دل کا کانٹا نکل جائے گا اور وہ حقیقی آزادی کی جنگ میں سب سے آگے ہوں گے۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ میں ہندوستان اور اپنی قوم کے مسئلہ کو ایک دفعہ ورلڈ پلیٹ فارم پر زیرِ بحث آتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور سمجھتا ہوں کہ لندن میں ہندوستان کی گول میز کانفرنس ایک ورلڈ پلیٹ فارم ثابت ہو گی۔

("الامان" روزنامہ رئیس الاحرار نمبر، جلد ۱۲ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۹ فروری ۱۹۳۱ء)

ڈاکٹر یوسف حسین خاں

مولانا محمد علی جوہر اور جامعہ ملیہ اسلامیہ

ہندوستان میں جنگ عظیم کے دوران میں ہوم رول کی تحریک نے ملک کے تعلیم یافتہ طبقے میں آزادی کی خواہش پیدا کردی تھی۔ لیکن عوام ابھی بے حس و حرکت تھے۔ انگریزی حکومت کی بوکھلاہٹ نے ہندوستان کی سیاست میں وہ کام کیا کہ جو معمولی حالات میں شاید صدیوں میں نہ ہوتا۔ جلیان والا باغ کے قتل عام نے پورے ملک میں آزادی کا صور پھونک دیا۔ بجھے ہوئے دلوں میں آزادی کی امنگ نے جنم لیا۔ جنگ کے خاتمے پر انگریزوں نے ترکوں کے ساتھ جو سلوک کیا اس سے ہندوستان کے مسلمانوں میں انگریزی سامراج کے خلاف نفرت کا جذبہ ابھر آیا اور خلافت کی تحریک نے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر غفلت کی نیند سے بیدار کردیا اس تحریک کے روح رواں۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری بھی اس تحریک کے لیڈروں میں تھے۔ مہاتما گاندھی نے ترک موالات کی آواز بلند کی تو خلافت کی تحریک کے سب حامی ان کے یار و مددگار بن گئے۔ ان کی بدولت ملک کی آزادی کی تحریک میں جان پڑ گئی۔ یہ تحریک اب دستوری احتجاج کے دائرے سے باہر نکل کر انقلاب کی وسیع فضا میں پھیل گئی۔ لوگوں کے دلوں میں نیا جوش، نیا ولولہ اور نیا عزم پیدا ہوگیا جس کی مثال پہلے نہیں ملتی۔ اس تحریک کا ایک جزیہ تھا کہ طلباء اسکول اور کالج چھوڑ کر آزادی حاصل کرنے کے لئے قومی خدمت کو اپنا مقصد قرار دیں۔ مولانا محمد علی اور دوسرے لیڈروں نے

ترک موالات کا پیغام اکتوبر ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ کے طلباء کو پہنچایا۔

ذاکر میاں ان طلباء کے قائد تھے جو مولانا محمد علی کی سرکردگی میں اولڈ بوائز لاج سے پولیس کی مدد سے نکلوائے گئے۔ ان طلباء کو اصرار تھا کہ انھیں آزاد فضا میں اپنی تعلیم جاری رکھنے کا موقع ملنا چاہیئے۔ چنانچہ قوم کے سربرآوردہ اصحاب نے فیصلہ کیا کہ ایک قومی تعلیمی ادارہ قائم کیا جائے جس کا نام جامعۂ ملیّہ اسلامیہ (نیشنل یونیورسٹی) ہوگا۔ نیشنل اس اعتبار سے کہ اس کی جڑیں قومی زندگی کی گہرائیوں میں سرایت کئے ہوئے ہوں اور مسلم اس لحاظ سے کہ وہ اسلامی تعلیم و تمدّن سے اپنی قوت و تازگی حاصل کرے گا۔

اتفاق سے جس روز مولانا محمد علی اور اُن کے ساتھیوں کو پولیس نے اولڈ بوائز لاج سے نکالا اور ان کا جلوس وہاں سے کرشنا آشرم روانہ ہوا تو اس وقت میں وہاں موجود تھا۔ میں بھی جلوس کے ساتھ ساتھ گیا۔ کرشنا آشرم میں پہلے سے خیموں کا انتظام تھا۔ زیادہ تر طلبہ ان ہی میں ٹھہرے تھے۔ کہاں پکّی بارک کے آراستہ و پیراستہ کمرے اور کہاں ان خیموں کی بے سروسامانی۔ لیکن سب نوجوان ایسا خوش تھے کہ وہ اپنی تکلیفوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ اسلام کی اور قوم کی خدمت کے خیال میں مست ہو رہے تھے۔

۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ ملیّہ اسلامیہ کے قیام کا اعلان ایم۔ اے۔ او کالج کی جامع مسجد میں ہوا۔ مولانا محمود الحسن کے متبرک ہاتھوں سے اس کی تاسیس کی رسم ادا ہوئی۔ مولانا محمود الحسن علالت کی وجہ سے بہت کمزور اور ناتوان تھے۔ ان کے شاگرد رشید مولانا شبیر احمد عثمانی نے ان کا خطبہ پڑھا جس کے چند اقتباس یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

"اے نونہالان وطن"۔ جب میں نے دیکھا کہ میرے درد کے غمخوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں

کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا۔

کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت لوگ میرے اس نعرہ پر نکتہ چینی کریں اور مجھ کو اپنے مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتلائیں۔ لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ جس قدر میں بظاہر علی گڑھ کی طرف آیا ہوں اس سے کہیں زیادہ علی گڑھ میری طرف آیا ہے...... مجھے لیڈروں سے زیادہ ان نونہالان وطن کی ہمت بلند پر آفریں اور شاباش کہنا چاہیئے جنھوں نے اس نیک مقصد کی انجام دہی کے لئے اپنی ہزاروں امیدوں پر پانی پھیر دیا اور باوجود ہر قسم کی طمع اور خوف کے وہ موالات نصاریٰ کے ترک پر نہایت مضبوطی اور استقلال کے ساتھ قایم رہے اور عزیز زندگیوں کو ملت اور قوم کے نام پر وقف کر دیئے"،

جامعہ کے مقاصد کی نسبت مولانا محمود الحسن نے ان الفاظ میں ذکر فرمایا

"مسلمانوں کی تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اغیار کے اثر سے مطلقاً آزاد۔ کیا باعتبار عقائد و خیالات اور کیا باعتبار اخلاق و اعمال ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں اور ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیئے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سے غلام پیدا کرتے رہیں بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونا چاہیئں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنھوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا اس سے پیشتر کہ ہم اس کو اپنا استاد بناتے"۔

مولانا محمود الحسن کا یہ خطبہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ اس کی نسبت ذاکر میاں نے پچیس سال بعد جامعہ کی سلور جوبلی کے موقعہ پر ان الفاظ میں ذکر کیا۔

مجھے وہ وقت یاد ہے اور میرے متعدد ساتھیوں کو بھی جب

علی گڑھ کالج کی مسجد میں ایک وجود مقدس، قید و جلا وطنی، علالت اور تفکرات ملی نے جس کی ہڈیاں پگھلا دی تھیں۔ جس کے چہرے کی زردی سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ غم کی آنچ نے خون کا ایک ایک قطرہ خشک کر دیا ہے جس کی روشن آنکھیں اس یقین کی غمازی کر رہی تھیں کہ اگرچہ سب کچھ بگڑا ہوا دکھائی دے رہا تھا لیکن مردوں کی طرح ہمت کی جائے تو مدد خداوندی سے سب کچھ بن سکتا ہے۔ یہ وجود مقدس دیوار کا سہارا لئے بیٹھا ہے ناتوانی کے باعث مجمع کو مخاطب بھی نہیں کر سکتا اور اس کا پیام اس کے شاگرد مولانا شبیر احمد عثمانی سناتے ہیں۔

"صاحبو" یاد رہے کہ وہ جس دیوار کا سہارا لئے بیٹھے تھے وہ خالی اینٹ پتھر کی دیوار نہ تھی اور وہ نہ صرف ان نوجوانوں کو مخاطب فرما رہے تھے جو اُن کے سامنے تھے۔ اُن کا روئے سخن قوم کی ساری آنے والی نسلوں کی طرف تھا اس وقت کسی مکان کا سنگ بنیاد نہیں رکھا گیا تھا۔ کسی عمارت کا افتتاح نہ ہو سکتا تھا چندوں کا اعلان بھی نہ ہوا تھا کہ یہ قافلہ سروسامان چھوڑ کر بے سروسامانی کی طرف رواں ہو رہا تھا۔ یہ وقتی فائدے کے بدلے وقتی نقصان کا سودا کر رہا تھا۔ اسے عاجلہ کے مقابلے میں آخرہ زیادہ عزیز تھی۔ وہ محنت اور مشقت کا عزم لے کر تعمیر نو کے لئے نکلا تھا۔ اور اس کی کلفتوں اور محنتوں کو دوسری سہولتوں اور تن آسانیوں سے زیادہ عزیز رکھنا چاہتا تھا یوں اور اسی فضا میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کام شروع ہوا تھا،

"۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو"

جامعہ کی ابتدا شدید دینی جذبہ کے سایہ میں ہوئی۔ ایم۔ اے۔ او کالج کے آرام و آسائش والے کمرے چھوڑ کر نوجوانوں نے انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں ایک دو دن نہیں۔ مہینوں پر مہینے کاٹ دیئے۔ علی گڑھ کے طلباء کو اپنی مادر علمی سے محبت نہیں عشق تھا۔ یہاں کے در و دیوار کو دیکھ دیکھ کر

جن کی ہر اینٹ میں ماضی کی داستانیں اور حوصلہ مندیاں خوابیدہ تھیں اِن کے ذہن وتخیل کی پرورش ہوتی تھی جب یہ درو دیوار روح کے لئے قید خانہ بننے لگے تو خود علی گڑھ کے فرزندوں نے انھیں ڈھا دینے کا فیصلہ کیا وہ اپنے دلوں کی بستی کو آباد کرنے کے لئے اسے ویران کرنے پر آمادہ ہو گئے کرشنا آشرم کے صحن میں خیموں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ مولانا محمّد علی نے جو جامعہ کے پہلے پرنسپل تھے اِن ہی خیموں میں اپنے درس کا سلسلہ شروع کیا ان درسوں کا موضوع تھا "اسلام اور اسلامی زندگی" جب بولتے تو فصاحت وبلاغت کا دریا بہا دیتے گھنٹہ دو گھنٹے چار چار گھنٹے متواتر تقریر کا سلسلہ جاری رہتا۔ سننے والے ہیں کہ کوئی اپنی جگہ پر ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ان کے سننے سے سیری ہوتی ہی نہیں۔ صبح ناشتے کے بعد درس کا سلسلہ شروع ہوتا تو ڈیڑھ دو بج جاتے۔ لیکچر دینے والے اور لیکچر سننے والے ایسا لگتا تھا جیسے کسی اور ہی دنیا میں ہوں۔ یہ دنیا بلند مقاصد کی دنیا تھی۔ مولانا محمد علیؒ لیکچر کے دوران میں اقبال کی اسرار خودی اور رموز بے خودی کے اشعار کی توضیح کرتے۔ لڑکے ہیں کہ نوٹ لکھ رہے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ مولانا نے جو فرمایا اس میں سے کچھ رہ جائے۔ لفظ بلفظ نقل کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکچر کے بعد آپس میں مقابلہ کر کے اپنے اپنے نوٹ مکمل کر لیتے۔ بعض طلبا زود نویس تھے۔ جن کی تحریروں کی بڑی مانگ ہوتی۔ ہر ایک کی یہ کوشش تھی کہ مولانا کی تقریر میں سے ایک لفظ بھی چھوٹ نہ جائے۔

مولانا محمد علی کا بولتے بولتے گلا بھر جاتا اور کبھی کبھی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ان کے دینی جذبہ کا اخلاص غیر مشتبہ تھا، اس لئے اُن کی ہر بات دل پر اثر کرتی تھی۔ مولانا کی تعلیم و تربیت سے ہر نوجوان میں ایک نیا عزم، نیا ولولہ اور نیا دینی احساس بیدار ہو گیا۔ ان کی اندرونی زندگی میں اخلاقی نشوونما کی ایک خاص لگن پیدا ہو گئی۔ جس کی مثال ملنی دشوار ہے

مولانا کے درسوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ نوجوان قرآن کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جیسے کوئی مدتوں سے بھولی ہوئی نعمت ہاتھ آگئی ہو۔ صبح فجر کی نماز کے بعد پابندی سے قرآن کی تلاوت ہوتی۔ ترجمے اور تفسیریں پڑھی جاتیں۔ نماز اور روزے کی پابندی خوش دلی سے کی جاتی نہ کہ جرمانے کے ڈر سے ان سب باتوں میں چاہے کسی کو رومانیت نظر آئے لیکن ان کا اخلاص غیر مشتبہ ہے جس سے نوجوانوں کی سیرت کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس دینی جذبہ کا مقصد نمائش نہ تھا بلکہ اپنی ذات کی اصلاح اسلامی تعلیم کے ذریعے۔ بعض نوجوان جو ایم۔اے۔او کالج میں چہ غم کے اصول کے ماننے والے کھلنڈرے مشہور تھے۔ راتوں کو اٹھ کر نمازیں پڑھتے اور مسجدوں میں گڑگڑاتے۔ یہ منظر مسلمان نوجوانوں کی اجتماعی زندگی میں بھلا کاہے کو دیکھنے میں آئے گا۔

سمجھے ہر سجدہ کو معراج جو زاہد چکھ لے\
درِ توبہ پہ مری ناصیہ سائی کے مزے\
آگئی وادیٔ پر خار بڑھاؤ تو قدم\
پھر نہ کہنا نہ ملے راہنمائی کے مزے\
شعرِ جوہر کی ہو کیا قدر سبکساروں میں\
ہم سے پوچھے کوئی اس ہرزہ سرائی کے مزے

جوہر

کامل القادری

پیکرِ فکر و عمل

مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت ہمہ رنگ کا ایک فقرے میں اگر کوئی اظہار کرنے کا خیال دل میں لائے تو ناگاہ اس کی نظر قوس قزح کے نظارے میں کھو جائے گی۔ مذہب و اخلاق، فلسفہ و تصوف، سیاست و رزم آرائی، ادب و صحافت، حسن و جمال اور ظرافت و بزلہ سنجی کے متوازن خمیر سے ان کی شخصیت تعمیر ہوئی۔ رامپور، بریلی، علی گڑھ اور اکسفارڈ نے ان کے جوہر خداداد کو نکھارا سنوارا اور ایک صورت دی۔ کارزار سیاست میں انھوں نے جب سر سے کفن باندھ کر اور بڑودا کی سول سروس سے مستعفی ہو کر قدم رکھا تو قلم بردا سے تھے اور انھوں نے قرطاس ابیض پر اپنی جودت طبع، ذہانت و فطانت، بزلہ سنجی، و ظرافت کے ایسے نقش و نگار بنائے جو جاوداں ہو گئے . . . . . . اور انگریزی و اردو صحافت نے ایک نئی کروٹ لی۔

وہ مسلم لیگ کے بانیوں میں ایک تھے اور انھوں نے نہ صرف ۱۹۰۶ء کی کانفرنس کی روداد مرتب کر کے شائع کی بلکہ مسلم لیگ کے قواعد و ضوابط مرتب کئے اور مسلم لیگ کی تنظیم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، لہٰذا ۱۹۱۷ء میں انھیں آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا گیا۔ . . . اور ان کی نظر بندی کی وجہ سے اُن کی تصویر کرسی صدارت پر رکھی گئی۔

جب عالم اسلام پر ادبار کی گھٹا چھائی اور خلافت ترکیہ کو خطرہ لاحق ہوا تو انھوں انھوں نے عالم اسلام کی اس مرکزیت کو قائم رکھنے کے لئے "خلافت کمیٹی" کی تشکیل فرمائی اور پھر پورے ہندوستان میں برطانوی سامراج کے خلاف فضا پیدا کر دی، یہاں تک کہ گاندھی ایسے شاطر زماں

سیاست داں کو بھی خلافت تحریک کی حمایت کے لئے رام کر لیا اور پہلی مرتبہ مسٹر گاندھی ہندوستان گیر دورہ کر سکے اور وہ پورے ہندوستان کے لیڈر بنے۔

یہ مولانا محمد علی ہی تھے، جنھوں نے کانگریس کو لبرل قیادت سے نجات دلا کر انقلابی جماعت بنایا اور ڈومینین اسٹیٹس کے بجائے کامل آزادی کا نصب العین دیا۔ لہٰذا ۱۹۲۳ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا انھیں صدر منتخب کیا گیا، اور انھوں نے کانگریس کی از سرِ نو تنظیم انقلابی خطوط پر فرمائی۔ اور سیاسی یتیم جواہر لال نہرو کو جنرل سکریٹری بنایا۔

وہ بھی ابتداء میں اپنے عہد کے مسلم و ہندو زعماء علامہ اقبال، ابوالکلام، مالوی جی، آزاد، سرتیج بہادر سپرو، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری شوکت علی، مسٹر محمد علی جناح کی طرح "ہندو مسلم اتحاد" کے خواہاں تھے اور برعظیم کی آزادی کے لئے نہ صرف ان دونوں بلکہ دوسری تمام اقلیتوں کے اتحاد کو بھی ناگزیر سمجھتے تھے۔ ابتداء میں کرم چند گاندھی کے متعلق بھی یہ حسن ظن تھا کہ وہ "ہندو مسلم اتحاد" کے خواہاں ہیں۔ لیکن تجربات نے مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کے حسنِ ظن کو بری طرح مجروح کیا۔ گاندھی جی سیاسی حکمت عملی کے تحت محض اسٹنٹ کے طور پر "ہندو مسلم اتحاد" کا نعرہ لگاتے تھے، لیکن مخلص نہ تھے مثلاً جب کوہاٹ کے ہندو مسلم فساد میں ایک ہندو مارا گیا تو انھوں نے برت رکھ لیا لیکن جب بتیا میں ہندو مہا سبھا نے مسلمانوں کا قتل عام کیا تو مسٹر گاندھی نے چپ سادھ لی۔ یہی وہ تجربات تھے جن کے پیش نظر مولانا محمد علی نے بالآخر ۱۹۲۵ء میں گاندھی جی پر فاتحہ پڑھی اور کانگریس سے مستعفی ہو گئے۔ کیوں کہ ان کی نظر میں ہندو مہا سبھا اور کانگریس دونوں برعظیم کے مسلمانوں کی عملاً بیخ کنی پر کاربند تھے، گو دونوں کا طریقۂ کار مختلف تھا۔ مولانا محمد علی نے اپنی سیاسی زندگی کی جو روداد کانگریس سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد خلافت کانگریس منعقدہ کلکتہ دسمبر ۱۹۲۸ء کے فی البدیہہ صدارتی خطبہ میں پیش کی ہے، وہ یہ ہے۔

" بیس برس سے زیادہ کا عرصہ ہوا کہ مجھے آپ نے ملک کے سامنے آتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ خواہ علی گڑھ کالج کے پرانے طالب علم کی حیثیت سے، یا لیگ کے صدر کی حیثیت سے اور آخر میں کانگریس کے ایک رکن اور پھر ایک صدر کی حیثیت سے اور آج خلافت کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے آپ کے سامنے آیا ہوں۔ لیکن میرے عزیز ترین دوستوں اور عزیزوں کو اس کا علم ہوگا اور بڑے بھائی شوکت علی کو جو میری پرائیویٹ زندگی کے حال سے بھی واقفیت رکھتے ہیں، کہ میں نے کسی جلسہ کی خواہ وہ پرائیوٹ ہو یا سیاسی یا ملکی، چھوٹا بڑا، کیسا ہی جلسہ ہو کبھی صدارت کی تمنا نہیں اور کسی جماعت کا کوئی منصب یا عہدہ قبول نہیں کیا۔ اپنے نوعمر ساتھیوں میں عہدے اور منصب کی خواہش کو دیکھا کرتا تھا جو جوانوں سے بہت رقابت کا باعث ہوتی ہے اور کام خراب کرتی ہے۔ میں نے جو کچھ تعلیم حاصل کی تھی اس سے سبق مل گیا تھا کہ اگر دنیا میں کوئی نام و نمود چاہتا ہے تو وہ صرف کام ہی سے حاصل ہو سکتا ہے اور کام کے لئے عہدے کی ضرورت نہیں۔ "

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ دسمبر ۱۹۲۸ء کے بعد انھوں نے نہ کسی سیاسی جماعت میں شرکت کی اور نہ کوئی عہدہ قبول کیا۔ انہوں نے اپنے مطمع نظر کے لئے "ہمدرد" کو زندہ رکھنے کی جان توڑ کوشش کی، لیکن بالآخر اسے بھی مالی خسارے اور ابتر معاشی بدحالی کی بنا پر بند کر دینا پڑا۔ یہ مولانا محمد علی جوہر کی صبر آزما آزمائش کا زمانہ تھا۔ اُن پر ہر طرف سے پے در پے وار ہو رہے تھے۔ ہندو مہاسبھا، کانگریس نیشنلسٹ مسلمان اور خطاب یافتہ ہندو مسلمان ان کے بدترین دشمن تھے حکومت برطانوی ہند بھی انھیں رسوا کرنے میں کسی سے پیچھے نہ تھی لیکن وہ اپنے مطمع نظر سے روگردانی تو کجا اس کو منوانے کی جنگ لڑ رہے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب مولانا محمد علی کی صحت تباہ ہو چکی تھی

ایک آنکھ کی بینائی ماند پڑ چکی تھی، ہائی بلڈ پریشر تشویشناک صورت حال کا انتباہ کر رہا تھا اور ذیابطیس کی وجہ سے جسم پر ورم آچکا تھا۔ لیکن ان جسمانی بیماریوں کے ساتھ ساتھ اب مولانا محمد علی تنہا رہ گئے تھے کہ وہ مسلم کش نہرو رپورٹ کو مسلمانان ہند کے لئے محضر نامہ قتل تصور کرتے تھے۔ کانگریس اور ہندو مہاسبھا کے ساتھ ساتھ کچھ مسلمان بھی ان سے خوش نہ تھے کہ وہ مسلمانوں کے مستقبل کا آئینی تحفظ چاہتے تھے۔ ان کی نظر میں زعماء مسلم کی دہلی تجاویز اصلاً ایک تجویز تھی۔ اُن کی زبانی سنیئے:۔

"دہلی تجاویز . . . . . درحقیقت ایک تجویز کا نام ہے اور وہ یہ کہ اگر ہندو اقلیت پانچ صوبوں میں ہمارے انصاف پر اعتماد کرنے کو آمادہ ہیں، تو ہماری اقلیتیں بھی نو صوبوں میں ان کے انصاف پر اعتماد کرنے کو آمادہ ہیں ورنہ نہیں۔"

سر محمد شفیع گروپ اور خطاب یافتہ مسلمانان ہند بھی اُن سے خوش نہ تھے کہ اُن کی نگاہیں ناک سے نیچے دیکھنے کی سکت نہ رکھتی تھیں۔ مولانا محمد علی "مخلوط انتخاب" کے سخت نکتہ چیں تھے اور اس کے بجائے کانگریس (مدراس سیشن) اور آل انڈیا مسلم لیگ (کلکتہ سیشن) سے انھوں نے "مشروط مخلوط انتخاب" کی قرارداد منظور کرائی تھی۔ مولانا محمد علی "جداگانہ انتخاب" کے حق میں نہ تھے، جس کی وجہ محض یہ تھی کہ انکے تحت الشعور میں یہ نکتہ جاگزیں تھا کہ مسلمانانِ ہند ایسی اقلیت نہیں جیسے اچھوت عیسائی، آدی باسی، ناگا، سکھ وغیرہ ہیں۔ "جداگانہ انتخاب" کو تسلیم کرنے کے معنی منطقی طور پر یہ ہوتے کہ مسلمانان ہند ایک قوم نہیں . . . . . بلکہ بہت سی اقلیتوں کی طرح ایک اقلیت ہے۔ لیکن مولانا محمد علی کا خلّاق ذہن اور بصیرت افروز نظریں جو کچھ دیکھ رہی تھیں، اس کا ادنیٰ احساس بھی برطانوی راج کے پروردہ خان بہادروں، سروں اور شمس العلماء کو نہ تھا۔

مولانا محمد علی کے رفقاء بچھڑ چکے تھے ۔ قوم نے اس حد تک منہ پھیر لیا تھا کہ انھیں ۱۹۲۹ء میں اس " ہمدرد " کو بند کردینے کا اُنھیں اعلان کرنا پڑا جسے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا اور جس کے حرف حرف کو دل میں اتارا جاتا تھا ۔ لیکن انھوں نے ہمت نہ ہاری ۔ میدان کارزار میں نبرد آزمائی کا جوہر دکھاتے رہے ۔

۱۹۳۰ء تک پاکستان کا تصور کوئی حقیقی شکل اختیار نہ کر سکا تھا ۔ سرسید احمد خاں سے مولانا محمد علی جوہر تک گو زیادہ فاصلہ نہ تھا ۔ لیکن مولانا محمد علی کو " دو قومی نظریہ " کا حقیقی عرفان اپنی وفات سے چند دن پیشتر ہوا ۔ لہٰذا انھوں نے وزیر ہند ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کو خط لکھتے ہوئے اسی حقیقت پر زور دیا کہ مسلمانان ہند ۔ ۔ ۔ ۔ ہندوستان میں اقلیت نہیں بلکہ ایک قوم ہے ۔ لہٰذا ہم اسے بجا طور پر پاکستان کی جانب پہلا باشعور قدم قرار دے سکتے ہیں ۔ خطبۂ الہ آباد میں علامہ اقبالؒ نے بھی مولانا محمد علی جوہر کے اسی موقف کو مرکز نظر رکھا ہے ۔ اور مسٹر محمد علی جناح نے بھی اسی ایک نکتہ کی وکالت کرکے نہ صرف قائد اعظم ثانی (اس لئے کہ مولانا محمد علی جوہر کو بھی متعدد اخبارات نے قائد اعظم کے لقب سے ملقب کیا ہے) بنے بلکہ ایک نئی مملکت بھی حاصل کرلی ۔ لہٰذا ہم بجا طور پر مولانا محمد علی جوہر کو بانیان پاکستان میں خشت اول قرار دے سکتے ہیں ۔

" نظریہ دو قومی " ہی پاکستان کا وہ اساسی نظریہ ہے جو پاکستان کی تشکیل کا سبب بنا ۔ ملاحظہ فرمائیے :۔

سب سے پہلے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہندو مسلم سوال کا نام اقلیتوں کا سوال رکھنا بالکل غلط ہے ۔ ہندوستان میں بلاشبہ کچھ اقلیتیں ضرور ہیں اور یقیناً ہم کو اُن کے لیئے ایسا انتظام کرنا چاہیئے کہ وہ یہ محسوس کریں کہ آئندہ حکومت ہند بعض یا ایک یا دو اقوام کی حکومت نہ ہوگی ۔ "

"خط کشیدہ فقرہ" ایک یا دو اقوام پر توجہ فرمایئے۔ آگے فرماتے ہیں۔"

" ہندوستان میں مسلمان اس قسم کی اقلیت نہیں ہیں جس معنی میں کہ جنگ کے بعد یورپ میں یہ لفظ استعمال ہو رہا ہے جمعیت اقوام" یورپ کی اقلیتوں کا انتظام کرتی ہے، مگر ہمارے ہندوستانی فضلاء اور پروفیسر "جمعیت اقوام" سے اصولِ کار عاریتاً لاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک ایسی قوم جو ہندوستان میں سات کروڑ سے زیادہ ہے، بآسانی اس معنی میں اقلیت نہیں کہلائی جا سکتی جس مفہوم میں یہ لفظ جنیوا میں استعمال ہوتا ہے ۔ جب کہ یہ ساری دنیا میں چالیس کروڑ کے قریب ہے اور اس کا مطمع نظر یہ ہے کہ دنیا کی بقیہ اقوام کو اپنے طرز خیال اور اپنے نظریہ کا مقصد بنا لے، اور جو ایک عدیم المثال اخوت کی مدعی ہے ایسی قوم کو اقلیت کے نام سے پکارنا محض لغو ہے"

مولانا محمد علی بلا شبہ نظریہ دو قومی کے مصنف ہیں۔ گول میز کانفرنس منعقدہ لندن ۱۹۳۰ء کا کانگریس نے بائیکاٹ کیا تھا۔ گاندھی جی نے اپنے زعم میں از سر نو ترک موالات کا آغاز کر رکھا تھا۔ لیکن وہ ۔ ۔ ۔ برصغیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے بے معنی جذبات سے اغماض فرماتے ہوئے پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے ۔ ۔ ۔ ۔ انھوں نے یہ فیصلہ کیوں کیا ؟ ایک مقرب خاص جناب نوری کا انکشاف ملاحظہ فرمایئے۔ (مطبوعہ "الامان" جلد ۱۲ شمارہ ۱۳، مورخہ ۱۹ر فروری ۱۹۳۱ء رئیس الاحرار نمبر) وہ لکھتے ہیں :-

" راقم الحروف نے مولانا سے ایک پرائیوٹ صحبت میں پوچھا کہ کیا آپ کو یقین ہے کہ گول میز کانفرنس آپ کے مطمع نظر کو پورا کر دے گی ؟ اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا تھا کہ میں اس شخص کو عقلمند نہیں سمجھتا جو اس اصول پر عامل نہ ہو کہ جو کچھ اسے آسانی سے مل رہا ہے اس کے لینے

سے انکار کر دے اور صرف اپنے مطمح نظر کو پیش نظر رکھے، میرا مطمح نظر آزادیٔ کامل ہے۔ لیکن اگر مجھے کوئی ایسی چیز حاصل ہوتی ہے جو کم از کم آزادیٔ کامل کے حصول میں مدد دے سکتی ہو تو میں ایک ہاتھ سے اس کو لے کر جیب میں رکھوں گا اور دوسرا ہاتھ میز پر مار مار کر مطالبہ کرونگا کہ میرا سوال پورا نہیں ہوا۔

ایک اور سوال کے جواب میں مولانا نے فرمایا تھا کہ میں تین وجوہ سے گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کا قصد رکھتا ہوں۔

۱۔ اوّل تو اس وجہ سے کہ مجھے امید ہے کہ گول میز کانفرنس سے ہندوستان کو ایسی اصلاحات ملیں گی، جن سے ہندوستان بیس سال کے اندر آزادیٔ کامل حاصل کرنے کی طاقت حاصل کرے گا، اگر اس قسم کی اصلاحات حاصل ہوگئیں تو میں سمجھوں گا کہ گول میز کانفرنس کامیاب ہوگئی۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ گول میز کانفرنس کے انعقاد تک یا اس کے اندر میں فرقہ وار مفاہمت کی کوشش کرونگا اور چاہوں گا کہ مسلمانوں کے جائز اور معقول مطالبات آئینی طور پر تسلیم کر لئے جائیں، اگر اس میں کامیابی ہو گی تو آزادیٔ کامل کی منزل تک پہنچنے کے لئے، سب سے پہلا شخص میں ہوں گا جو مسلمانوں کو اور مسلمانوں کے ساتھ اپنے آپکو جنگ آزادی میں جو دس سال کے اندر ہونے والی ہے، آگے ۔۔۔ لے جاؤں گا اور مجھے یقین ہے کہ اگر فرقہ وار مسئلہ قابل اطمینان طریق پر طے ہوگیا تو مسلمانوں کے دل کا کانٹا نکل جائے گا اور وہ حقیقی آزادی کی جنگ میں سب سے آگے ہوں گے۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ میں ہندوستان اور اپنی قوم کے مسئلہ کو ایک دفعہ ورلڈ پلیٹ فارم پر زیر بحث آتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ لندن میں ہندوستان کی گول میز کانفرنس ایک روز

ورلڈ پلیٹ فارم، ثابت ہوگی۔

مولانا محمد علی" کی نگاہیں آنے والے دس سالوں میں جو جنگِ آزادی لڑی جانے والی تھی، اس پر مرکوز تھیں اور وہ بیس سالوں کے اندر اپنا خوابِ آزادیٔ کامل کو پورا ہوتے دیکھ رہے تھے .... اور بلاشبہ یہ اُن کی خداداد فراست کا ادنیٰ کرشمہ تھا۔ صرف سترہ سال بعد ہندوستان اور پاکستان دو مملکتیں نقشۂ جہاں پر ابھریں ۱۹۳۰ء میں اس کا تصوّر ان کے سوا کسے تھا! وہ نہایت دوربیں سلیم العقل سیاستداں اور باشعور محبِ ملّت قائد تھے اور ہر حالت میں وہ ایک طرف اپنے مطمح نظر کو سامنے رکھتے تھے اور دوسری طرف عملی سیاسیات کی نزاکتوں کو۔ گویا وہ سیاسی مفکر بھی تھے اور عملی سیاستداں بھی۔ وہ تمام عمر نبرد آزمائی کرتے رہے اور وفات بھی میدانِ جنگ میں ہوئی۔ ایسے اولالعزم لوگ صدیوں میں ہی پیدا ہوتے ہیں۔

خاک جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی
ہوسِ زیست ہے اس درجہ تو مرنا ہے یہی
قلزمِ عشق میں نفع و سلامت دونوں!
اس میں ڈوبے بھی تو کیا پار اترنا ہے یہی
قیدِ گیسو سے بھلا کون رہے گا آزاد !!!
تیری زلفوں کے جو شانوں پہ بکھرنا ہے یہی
اے اجل تجھ سے بھی کیا خاک رہے گی امید
وعدہ کر کے جو ترا روز مکرنا ہے یہی

(جوہرؔ)

ریاض صدیقی

جوہر کی شعری دنیا

ہم ایسے دور میں جی رہے ہیں جو سوالوں کا عہد ہے۔ صنعتی دور کی تجارتی گرم بازاری اور اس کے زیر اثر فروغ پانے والی پبلک ریلیشنگ اور مصلحت بینی کا کرشمہ دیکھیے کہ سوالوں کے صحیح جوابات نہیں ملتے۔ تاریخ کے نگارخانوں میں قدم رکھیے تو حقائق کو نقطہ ہائے نظر اور مخصوص مقاصد کے حصول کی خاطر نئے معنی اور لباس عطا کر دیئے گئے ہیں۔ اس پس منظر میں اتفاق سے یہ سوال ابھرا ہے کہ محمد علی جوہر کی شعری و ادبی شخصیت کا تاریخ ادب میں کیا مرتبہ و مقام ہے۔

ان کے بارے میں بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ اس دور کے لوگ انہیں رئیس الاحرار اور قائد اعظم جیسے القابات سے یاد کرتے تھے۔ ان کی وفات پر "سیاست"، "پیام ملت"، "الجمیعت" اور "مدینہ" بجنور نے جو خصوصی شمارے شائع کئے تھے۔ متذکرہ القابات پر سند ہیں۔

سرسید کی ادبی تحریک کے بعد، اور ترقی پسند تحریک سے پہلے کے وقفہ میں مولانا محمد علی جوہر کی شعری ادبی شخصیت رابطہ کی کڑی تھی۔ کلاسیکی ادبیات و شعریات کا از سر نو جائزہ لینے والے ان نقادوں نے جو واقعیت پسندی، سائنسی شعور اور معروضی تجزیئے پر گرفت رکھتے تھے، یوں تو دفتر کے دفتر کالے ڈالے۔ نظیر اکبر آبادی جیسے شاعر کی کھوئی شخصیت کا سراغ لگایا۔ اور سرسید کے مجموعی مشن کا اعتراف کیا۔ محمد علی جوہر کے نام کو کیوں نظر انداز کر دیا کہیں ایسا تو نہیں کہ

لیلائے سیاست کی طرح کشورستانِ ادب کے مصلحت پسندوں نے یہاں بھی ہموار کیا ہو۔ کہ مولانا بہرحال نہایت جری، بے باک، حق گو اور کھری شخصیت رکھتے تھے اس حقیقت کا تو ہمیں بھی اعتراف ہے کہ بیسویں صدی کے برصغیر کی سیاست و صحافت میں ان کے تاریخ ساز اور عہد آفریں پہلو ایسی وسعتیں اور معنوی جہتیں رکھتے ہیں۔ کہ ان کی ادبی و شعری شخصیت انفرادیت اور افادیت کے باوجود پس منظر میں جا پڑتی ہے۔ دوسری طرف اکبرؔ اور اقبالؔ کی قومی اور نظریاتی شاعری کا وہ جادو برصغیر کی ملت اسلامیہ پر سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اور علمی و فکری قلمرو اقبال کے یہاں پلٹے جانے والے ظاہری و باطنی تضاد سے لاعلم تھی۔ اس صورت حال کے باوجود اہل نقد و نظر ان حقائق کے سہارے اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش کیونکر ہو سکتے ہیں۔

ان کی شعری اور ادبی شخصیت ہی کا طلسم تھا کہ شہرۂ آفاق انگریزی ادیب ایچ۔ جی ویلز ان کے قلم کو میکالے کا قلم، ان کی زبان کو برک کی زبان اور دل کو نپولین کا دل کہنے پر مجبور ہوا۔ اور جیل سے رہائی کے بعد جس وقت مولانا امرتسر پہنچے تو خود علامہ اقبالؔ نے جلسہ عام میں انہیں خراج تحسین پیش کیا۔ تاریخی تناظر میں دیکھئے تو مولاناؔ دبستانِ رام پور کے تیسرے دور کا روشن چراغ بھی ہیں۔ یہ ۱۸۸۷ء

لہ۔ تاریخ کا غیر جانبدارانہ مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۳۰ء تک کی سیاسی کشمکش پر مولانا چھائے ہوئے تھے۔ اور دوسری تمام سیاسی شخصیات ان کے زیر سایہ تھیں مولانا کی سیاست اور صحافت ہی کی مدد سے گاندھی، نہرو اور دوسرے اہلِ سیاست نے اپنے کیریئر بنایا۔ ورنہ یہ ساری ہستیاں گمنام حیثیت رکھتی تھیں اور کانگریس اور مسلم لیگ کے مستقبل ہی کے بانی نہیں ۱۹۰۶ء کی مسلم لیگ کے بھی بانی تھے۔ دو قومی نظریہ اور تصورِ پاکستان کے امکانات ان کے ہاں بالکل واضح ہو گئے تھے۔ ان کی اس حیثیت کا

تا ۱۹۳۰ء پر محیط ہے، رام پور نے شعری تاریخ کو فن و اسلوب اور مواد و معنی کے اعتبار سے کیا کچھ دیا۔ اس موضوع پر قائمؔ، شوقؔ، مصحفیؔ، غالبؔ، داغؔ، امیرؔ، جلالؔ اور نظامؔ کے حوالوں سے صفحے کے صفحے سیاہ کئے جا چکے ہیں۔ محمد علی جوہرؔ کے ذوق شعری کی خوابیدہ کلیاں اسی رام پور میں چٹکیں، جہاں قائمؔ، مصحفیؔ، غالبؔ اور اس کے بعد داغ اور امیرؔ کے نغمے گونج رہے تھے۔ ان کے بڑے بھائی ذوالفقار علی خاں بھی شاعر تھے۔ گوہرؔ تخلص کرتے تھے اور داغؔ کے شاگرد بھی تھے۔ مولانا نے ابتدائی دنوں میں اپنا کلام گوہرؔ ہی کو دکھایا اور ان کے ہمراہ اکثر داغ کی شعری محفلوں میں شریک بھی ہوئے، ذوقِ شعر گوئی ابھی ارتقاء کی پہلی منزل میں تھا۔ کہ وہ بریلی اور بریلی سے پھر علی گڑھ آگئے، علی گڑھ کے مخصوص ماحول اور رنگ نے ان کے ذہنی و فکری افق میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ ان دنوں یہاں حسرتؔ موہانی اور سید سجاد ویلدرمؔ جیسی ہستیاں موجود تھیں۔ چنانچہ علی گڑھ میں شعری و ادبی مجالس کا باقاعدہ سلسلہ چل نکلا۔

چودھویں رات کا وہ مشاعرہ جو کرکٹ لان میں ایک خاص انداز و ادا سے منعقد ہوتا تھا، مولانا ہی کے ذہن کی اختراع تھی[۱] جو بعد میں ایسی روایت بنی کہ قیامِ پاکستان تک جاری رہی۔

مولانا محمد علی جوہرؔ کی شاعری زبان و بیان انداز و ادا اور اسلوب کے اعتبار سے رام پور کی روایات کا عکس پیش کرتی ہے۔ رام پور اسکول کی خارجیت، معاملہ بندی، شوخی اور غزل کی روایتی ادائیں و آرائش و زیبائش جو یہاں کے شاعروں کا رنگ ہے مولانا کے یہاں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ مولانا کے بعض اشعار حسن و عشق اور مے و میخانہ جیسے موضوعات پر اپنی شوخی اور لطف بیان میں داغؔ اور نظامؔ کو آنکھ مارتے ہیں۔

اور ہندو مورخین بھی کرتے ہیں۔ مثلاً دی بریک اپ آف برٹش انڈیا مطبوعہ ۱۹۶۹ء کے مصنف بی این پانڈے

[۱] ۔ بیس بڑے مسلمان مصنفہ عبدالرشید لاہور۔

یہ ستانے کی نکالی ہے انوکھی ترکیب　　　　ضم کا نام ستمگر نے حیا رکھا ہے
رات بھر صحبت تک نہ چھوڑی تب کہیں　　　　رازہائے بادہ و ساغر کھلے
سو گئی تو مہ شب ماہ میں اگر　　　　سوچتا ہوں سامنے پر سا تب ہے

حسرت کی طرح عشق کی واردات کا زخم مولانا بھی کھا چکے تھے ۔ اس حقیقت کا اعتراف انہوں نے اپنے مکتوب بنام گاندھی مورخہ ۱۸ ر اکتوبر ۱۹۲۱ء میں کیا ہے۔[۳] اس پس منظر کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے کلام میں عشقیہ اشعار کا ملنا کوئی قابلِ ذکر واقعہ نہیں ہے۔ لیکن یہ بات ضرور قابلِ ذکر ہے کہ شاعری ان کے نزدیک محض ذہنی تفریح یا عشقیہ جذبات کے اظہار تک محدود نہیں تھی ، اور نہ وہ کلاسیکی فلسفہ ہی کے ہمنوا تھے ۔ شاعری مولانا کے لئے حیات و کائنات کے معنی و مقاصد اور عصری شعور و مظاہر کے انعکاس کا موثر وسیلہ تھی ۔ چنانچہ ان کی قومی ، سیاسی اور صحافتی زندگی کے کم و بیش سارے نشیب و فراز اشعار کے آئینہ میں صاف نظر آتے ہیں ۔ یہی وہ منزل ہے جہاں وہ دبستانِ رامپور کے مروجہ معیار سے آگے بڑھ کر اس دبستان کو نئی شعری روایت سے متعارف کراتے ہیں ۔
یہ نئی روایت رام پور اسکول کی تاریخ میں مولانا سے شروع ہو کر ان ہی پہ تمام ہو گئی۔ مولانا طبعاً صرف شاعر تھے ۔ چنانچہ شعریت کا عنصر ان کی صحافت اور گفتگو پہ بھی حاوی رہا حق گوئی و بیباکی کے ساتھ نظریہ سیاست اور طرزِ فکر کا اظہار ان کی شاعری کا بنیادی وصف ہے ۔ چنانچہ کہتے ہیں ۔ ؎

بے خوفِ غیر دل کی اگر ترجماں نہ ہو　　　　بہتر ہے اس سے یہ کہ سرے سے زباں نہ ہو

حسرت اور جوہر معاصر شاعروں میں ہیں دونوں شاعری سیاست اور صحافت کے بیک وقت مرد میدان ہیں ۔ دونوں کی ذہنی پرورش علی گڑھ کے ماحول میں ہوئی ہے

---

۳ ۔ علی برادران مصنفہ رئیس احمد جعفری ۔

دونوں کی حق گوئی و بے باکی اور عزم و ایقان اپنی مثال آپ ہیں، تمام یکساں رویوں کے باوجود دونوں کی شاعری میں ایک بنیادی اختلاف ہے۔ حسرت نے اپنا عمر بھر کی کشمکش اور سیاسی میدان میں جھیلے جانے والے مصائب کو غزل میں اظہار کا راستہ نہیں دیا۔ بلکہ خالص تغزل حسن و سرمستی اور پُر لطف اور رنگین فضا سے شاعری میں مسرت آفرینی اور لذت کی کیفیت پیدا کر دی۔ ان کے شعروں میں شوخی معاملہ بندی اور کھل کھیلنے والی کیفیات بھی ہیں۔ چھیڑ چھاڑ بھی ہے اور وصل کی سرمستی بھی ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انہوں نے زندگی بھر کے کرب تلخیوں اور تباہیوں کے زہر کو حسن و شباب اور نغمہ و مے کے سہارے خود اپنے لئے تریاق بنا لیا۔ مولانا جوہر نے اس کے برعکس سیاسی و سماجی زندگی اس دور کی حیثیت اور شعوری سطح پر رونما ہونے والے تغیرات کو شاعری میں در آنے کا موقع دیا۔ ان کی غزلوں میں مروجہ شعری لغت ہی کا استعمال ہوا ہے۔ علایم و استعارات اور تراکیب و الفاظ کے کلاسیکی سانچوں سے بھی انہوں نے کسی مرحلے پر روگردانی نہیں کی ہے۔ چنانچہ یہی انداز بعض اوقات فریب میں ڈالتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کے عہد اور بعد میں آنے والوں نے ان کی شعری لغت اور علائم و استعارات سے حقیقی معنی و مفاہیم تک رسائی حاصل کرنے میں ٹھوکریں کھائی ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر کا ایک گرانقدر کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے روایتی لغت، علایم و استعارات اور غزل کی رمزیت و اشاریت کو نئے مضمون اور نئی تعبیرات کے اظہار سے مالامال کیا ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ میں اس وقت جو کریڈٹ فیض کو حاصل ہے۔ اس کے اولین مستحق مولانا ہیں۔ ان کے اشعار عام مطالعہ میں حسن و سرمستی کی جو کیفیت پیش کرتے ہیں معنی و مقاصد کے اعتبار سے یکسر مختلف حقائق سے آگاہ کرتے ہیں۔ اس شعر میں ان کا سیاسی کیریر اور بعض سیاسی تجربات منعکس

ہوئے ہیں۔ ؎

یہ حالت ہو گئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے
کہ خم کے خم بھرے رکھے ہیں اور مے خانے خالی ہیں

بعض غزلوں میں تو اوّل تا آخر سیاسی تحریک، عزائم قید و بند کے تجربات کا انعکاس ہوا ہے۔ مثلاً "کے مزے" اور "نہ گے" ردیف میں کہی گئی غزلیں۔ ؎

کبھی چکھے ہی نہیں آبلہ پائی کے مزے
خضر کیا جانیں بھلا راہ نمائی کے مزے

پوچھتے کیا ہو بود و باش کا حال
ہم ہیں باشندے بندی خانے کے

کر دیا قیدِ قفس نے ہم کو آزادِ چمن
پاس کافی ہو چکا اب خاطرِ صیاد کا

عزمِ عاشق ہے خود اپنی کامیابی کی دلیل
نام بھی لینا نہ ہرگز کوششِ بے باد کا

یقیں آنے کو تو آجائے ترے عہد و پیماں کا
تری آنکھ اے بتِ وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے

فیض سے تیرے ہی اے قیدِ فرنگ
بال و پر نکلے قفس کے در کھلے

مولانا کی شاعری میں حصول منزل پر اعتماد کے ساتھ ساتھ عزم و ایقان کا وہ آہنگ بھی ہے جس نے ان کے لب و لہجے کو رجائی بنایا ہے۔ ان کی شاعری میں وطن دوستی، عالمگیر انسان دوستی اور فلاح و امن کے وہ سارے مقدس آدرش راہ پاگئے ہیں جو ان کی سیاسی اور فکری تحریک کا جزو اعظم رہے ہیں۔ اس پہلو

پہر مولانا کے دور کے اہل رائے بھی بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ اور مدینہ بجنور مدینہ ۲۵ر جنوری ۱۹۳۱ء کی اشاعت میں غازی کا مضمون اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ غازی کو بھی اس حقیقت سے اتفاق ہے کہ ان کی شاعری گل و بلبل کی شاعری نہیں ہے

اپنی مجموعی خوبیوں کے ساتھ ساتھ مولانا کی شاعری ان کے ذہنی افکار و نظریات کی ترجمان بھی ہے۔ انہوں نے دین کو اس کے اصل اور حقیقی پس منظر میں منعکس کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وطن دوستی، عالمگیر انسان پرستی، غیر فرقہ وارانہ طرز معاشرت اور بقائے باہمی جیسے نظریات ان کے اشعار کا موضوع بنے ہیں۔ ان مسائل پر ان کا نقطۂ نظر تادمِ آخر بالکل واضح رہا۔ تاریخ میں ان کے افکار و نظریات کی اہمیت یوں بھی ہے کہ بعض فرقہ پرست دینی مکاتیب اور بے سند قسم کے خود ساختہ امام و مجتہدین دینی افکار و نظریات کی اور قرآن کی تعبیر و تشریح اپنی مرضی سے کر رہے تھے۔[4] مولانا کی ایسے لوگوں سے کبھی نہ بنی اور ان کے انتقال کے بعد ان باطل قوتوں کو کھل کھیلنے کے مواقع حاصل ہو گئے۔ آج ان باطل قوتوں کے نتائج واضح ہو کر ہمارے سامنے آگئے ہیں۔ مولانا کا نظریہ توحید اور صلح کل کا مسلک اس قسم کی فرقہ پرستی سے انکار کرتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض مفاد پرستوں نے ان پر کانگریس نوازی اور قوم پرستی کا الزام بھی لگایا ہو کہ

۴۔ اگر ہم سب حکم دینکم کے اصول پر عمل کرنے لگیں اور ساتھ ہی ساتھ روحانیت کی اصل شان تمام مذاہب میں مشترک ہے خصوصیت کے ساتھ پیش نظر رکھیں تو دنیا میں جنگ و جدال کا خاتمہ اور ہر جگہ امن و سلامتی کا دور دورہ ہو سکے گا۔ اسلام تمام دنیا کو متحد کرنے کے لئے آیا۔ جنگ کو مٹانے کے لئے آیا اور امن و عافیت کا پیام لیکر آیا۔ مدینہ بجنور مورخہ ۱۵ جنوری ۱۹۳۱ء۔

۵۔ دیکھئے مولانا کی تقاریر اور ہمدرد و مدینہ کے اداریے اور مضامین وغیرہ۔

غلط اور فتنہ انگیزی پر مبنی ہے۔ وہ دو قومی نظریئے اور تحریک پاکستان کا حرفِ اوّل ہیں مولانا کی شاعری کا ایک اور قابلِ ذکر پہلو واقعاتی شاعری ہے۔ بعض غزلوں میں ایسے اشعار ملتے ہیں جو کسی مخصوص واقعے یا وزنی مسئلہ کی ترجمانی کرتے ہیں۔

ہم معنیٔ ہوس نہیں اے دل ہوائے دوست	راضی ہو بس اسی میں ہو جس میں رضائے دوست[سے]
تیری صحبت ہمیں مطلوب تھی لیکن اس کو	نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں[سے]

واقعات و مسائل پر انہوں نے نظموں میں بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ ۳۰ مارچ ۱۹۱۹ء میں دہلی میں فائرنگ کے واقعہ سے متاثر ہو کر مولانا نے ایک غزل مسلسل کہی جس کا عنوان "نام و نشانِ دہلی" ہے۔ "دعائے اسیر" کے تمام اشعار جیل کی تخلیق ہیں اور دخترِ نیک اختر کی علالت سے متاثر ہو کر کہے گئے ہیں۔ ایک نظم انہوں نے اپنے عزیز دوست اور کامریڈ کے معاون غلام حسین کی وفات پر کہی تھی۔

محمد علی جوہر کی شاعری میں بعض اساتذہ کا رنگ و آہنگ بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بعض غزلیں ہیں جو انہوں نے حسرتؔ اور غالبؔ کی زمینوں میں کہی ہیں۔

ہے رشک کیوں یہ ہم کو سرِ دار دیکھ کر	دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر
آساں پسندیوں سے ہیں بیزار اہلِ عشق	چھانٹا یہ مرحلہ بھی ہے دشوار دیکھ کر

سے۔ علی برادران ص ۹۴۵ رئیس احمد جعفری

سے۔ یہ شعر دخترِ نیک اختر آمنہ کی وفات پر کہا گیا۔ اور بیٹی کی لوحِ مزار پر کندہ ہے۔

خوگرِ جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی | اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی
کشورِ کفر میں کعبہ کو بھی شامل کر لو | سیرِ ظلمات کو تھوڑی سی فضا اور سہی
کر گئی زندۂ جاوید ہمیں | تیغِ قاتل نے مسیحائی کی

محمد علی جوہر کی شاعری معنوی اعتبار سے ان کے دور کی شاعری ہے، ماضی میں اسکی جڑیں سرسید تحریک سے ملتی ہیں اور مستقبل میں ان کی شاعری آنے والے ترقی پسند دور کے امکانات کی نشان دہی کر رہی ہے۔ تاریخِ ادب میں اس حیثیت سے اکبر اور اقبال کے بعد مولانا کی شاعری کو جگہ ملنی چاہیئے۔

مولانا محمد علی

جو قتیلِ عشق ہے وہ زندۂ جاوید ہے

نہال سیوہاروی

خدمتِ اہلِ وطن ہے منتہائے زندگی | اس سے بڑھ کر اور کیا ہے کیمیائے زندگی
جان دیکر بھی علمبردارِ وطن مرتے نہیں | موت کے قبضہ سے باہر ہے لوائے زندگی
اے خوشا تقدیر اسکی جو شہیدِ فرض ہے | ہے لحاظِ فرض استمرارِ بقائے زندگی
وہ گھڑی کہتا ہے جسکو اک جہاں شامِ اجل | ہے مرے نزدیک صبحِ جانفزائے زندگی
قطع ہو کر جیسے پُر اثمار ہو جائے شجر | جانکنی سے ہے یوں ہی نشو و نمائے زندگی

مرگِ اہلِ عشق را طرحِ حیاتِ تازہ ایست
آں حیاتِ تازہ روئے زندگی را غازہ ایست

(الامان دہلی ۱۹ فروری ۱۹۳۱ء)

آبادی بیگم بی امّاں

بی امّاں کا خُطبہ

(مرحوم مولانا محمّد علی کو ایک بیوہ کے ہاتھوں نے پالا تھا۔ وہ بیوہ، تمام خواتینِ ہند کی سرتاج اور پورے ہندوستان کی رُوحانی ماں تھی۔ اُسے ہم سب "بی امّاں" کے پیارے گھریلو نام سے یاد کرتے ہیں، یہی وہ نام ہے جس سے شیر خوار محمّد علی نے زبان پھوٹنے پر اپنی ماں کو پُکارا تھا۔ نپولین اعظم نے کہا "میں کچھ نہ ہوتا، اگر میری ماں نے مجھ میں یہ جوہر پیدا نہ کئے ہوتے!" ہم یہی محمّد علی اور بی اماں کی بابت کہہ سکتے ہیں۔ ذیل کی تقریر بی اماں نے کولمبو کانگریس ہال سیلون میں ۱۵ر جنوری ۱۹۲۱ء میں کی تھی۔ اس سے معلوم ہوگا کہ وہ کس پائے کی خاتون تھیں۔)

میں آپ لوگوں کو بتانا چاہتی ہوں کہ ایسے نازک وقت میں آپ کو کیا کرنا چاہیئے، عورتوں کا فرض ہے کہ مردوں کو بہادر بنائیں۔ دُنیا کے کُل بڑے بڑے کاموں میں عورتوں نے بہت زیادہ حصّہ لیا ہے۔ عورتوں کا اوّلین فرض یہ ہے کہ نہایت پاک و صاف زندگی گزاریں۔ چاہے اپنے والدین کے مکان پر رہیں، یا شوہروں کے ساتھ رہیں۔ ہر جگہ اُنھیں اپنے قلوب کو پاک و صاف رکھنا چاہیئے۔ لوگ جو چاہیں کہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ خانہ داری کے تمام اہم کام انجام دینے والی عورتیں ہیں، مَرد اپنی تلواروں کے کارناموں سے یاد کئے جاتے ہیں۔ اور عورتیں اس روشنی کی وجہ سے یاد کی جاتی ہیں۔ جس روشنی میں مَرد اپنی جد و جہد کو جاری رکھ سکتے ہیں۔

اور کسی اہم تحریک کو انجام تک پہنچاتے ہیں ۔ اگر عورتیں اپنے مردوں کو شجاعت و جانثاری سے معرا سمجھیں تو انھیں لازم ہے کہ اپنی جانثاری سے مردوں کو سبق دیں اور انھیں آئندہ نسل کے لئے اُمید اور ہمت دلائیں ۔

میں ایک ضعیف عورت ہوں جب سے میں نے دُنیا میں قدم رکھا، دُنیا میں کتنے انقلاب ہوئے ہیں ۔ اور اب دُنیا کی وہ حالت نہیں ہے جو میری پیدائش کے وقت تھی ۔ میں بُوڑھی ہوں اور میرے خیالات پُرانے ہیں ۔ اور آپ لوگوں نے اپنے خیالات و طرزِ معاشرت کو بدل دیا ہے، جس کو میں پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتی ہوں ۔ مرد عورتوں کو کمزور جنس کہہ سکتے ہیں لیکن دراصل عورتیں مضبوط جنس سے ہیں ۔ عورتوں ہی نے مردوں کو قالب میں ڈھالا ہے اور اُن کی صورت و شکل دُرست کی ہے ۔ اگر عورتیں اپنے بچّوں اور شوہروں کو صحیح راستے پر نہ رکھیں تو یہ اُن کا قصور ہے ۔ اُنھیں چاہئے کہ اپنے بچّوں اور شوہروں کو بہادر بنائیں ۔ اگر آج بہادر مرد نہیں پائے جاتے تو قصور عورتوں کا ہے ۔

جب میں ہندوستان پر نظر کرتی ہوں، تو دیکھتی ہوں کہ ہندوستان کی عورتیں مردوں سے زیادہ مضبوط اور بہادر ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتیں غیر ممالک کے لوگوں سے نہیں ملی ہیں ۔ اور مردوں کو غیر ممالک سے سابقہ پڑا ہے ۔ میں بُوڑھی ہوں لیکن فخر کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ میں نے اپنے لڑکوں کو جیسا بنایا ہے، وہ دُنیا کی نگاہوں میں ظاہر ہے ۔ جب میرے شوہر کا انتقال ہوا، تو شوکت علی کی عمر ۵ یا ۶ سال کی تھی ۔ اور محمد علی صرف ۱۶ ماہ کے تھے اور دُودھ پی رہے تھے ۔ جب یہ بڑھے اور گھر کے انتظامات ان کے ہاتھ میں آئے تو حالت روز بروز ابتر ہوتی گئی ۔ اُس وقت میں نے اپنا فرض سمجھا کہ خود انتظامات کو سنبھالوں ۔ اسی طرح ہر عورت کا فرض ہے کہ اپنے مُلک کی عزت برقرار رکھنے کے لئے آگے بڑھے ۔

عورتوں کو اپنا عقیدہ نہایت مُستحکم رکھنا چاہیئے۔ کیوں کہ عقیدہ ہی انسانوں کو ترقی کے زینے تک پہنچاتا ہے۔ عورتوں کا مردوں پر ویسا ہی اختیار و اثر ہوتا ہے، جیسا لگام کا گھوڑے پر۔ لگام ہی کے ذریعہ گھوڑا صحیح راستے پر چل سکتا ہے۔

عورتیں مردوں کو صحیح راستے پر لگا سکتی ہیں۔ مردوں کے لئے سب سے بڑی صفت ہمّت و شجاعت ہے۔ اور عورتیں ہی مردوں کو باہمّت اور شجاع بنا سکتی ہیں، میری مثال دیکھو۔ میں نے پہلے اپنے بچّوں کی پرورش کی۔ پھر اُن کو تعلیم دلائی۔ اور جب تعلیم سے فارغ ہو چکے تو میں نے اُن کو سامنے بٹھا کر کہا کہ "میں چاہتی ہوں کہ تم لوگ بہادر سپاہی بنو۔"

شجاعت دِکھانے کے بہت سے طریقے ہیں۔ کسی کی لاٹھیوں سے خبر لینا شجاعت نہیں ہے، لڑنا تو جانوروں کی سی ہمّت دکھلانا ہے۔ اصلی ہمّت یہ ہے کہ دوسروں کو آرام پہنچایئے۔ اور مدد کرنے کی کوشش کی جائے۔ آپ جتنی زیادہ قربانیاں کریں گے، دوسروں کے لئے جتنی تکالیف اُٹھائیں گے اتنی ہی زیادہ آپ باہمّت کہلائیں گی۔ اگر آپ کے لڑکے ہوں، تو آپ کو چاہیئے کہ انھیں یہ تعلیم دیں کہ ہر عورت کی عزّت یکساں ہے۔ چاہے وہ عیسائی ہو یا پارسی، ہندو ہو یا مسلمان۔ ہر قوم کی عورتوں کی ویسی ہی عزّت کریں جیسی اپنی ماں کی عزّت کرتے ہیں۔

جب میرے دونوں لڑکے جیل میں نظر بند تھے تو حکومت نے میرے پاس ایک حکم نامہ بھیجا، جس میں مجھ سے یہ کہا کہ دونوں لڑکوں سے اس پر دستخط کرنے کی فہمائش کروں۔ اُس حکم نامہ میں اُن سے کہا جاتا تھا کہ اپنی آزادی کو حکومت کے ہاتھ فروخت کر ڈالو۔ اس وقت میں پردہ کی سخت پابند تھی۔ تاہم میں جیل میں گئی اور اپنے لڑکوں سے میں نے کہا کہ تمہاری آزادی مجھے بے حد محبوب ہے اور میں چاہتی ہوں کہ جہاں تک ہو سکے مصائب جھیلو لیکن

آزادی کو ہرگز ہاتھ سے مت جانے دو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم میرے ساتھ چلو لیکن اگر تم آزادی چاہتے ہو تو اپنے ملک و مذہب کے وفادار رہو۔ اور اگر تم نے اپنے ملک و مذہب کے خلاف کوئی حرکت کی تو میں تمہیں گلا گھونٹ کر مار ڈالوں گی۔

اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ کوئی ہندوستانی عورت ایسے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتی ہے۔ غالباً ان کے لڑکوں نے اُنھیں یہ تلقین کی تھی لیکن میں ایسے لوگوں سے صاف کہے دیتی ہوں کہ یہ دونوں لڑکے مجھ سے پیدا ہوئے ہیں نہ کہ میں ان سے۔ جب میں اپنے لڑکوں سے ملنے جا رہی تھی تو راستے پر بہت سے لوگ میرے لڑکوں کی درازیٔ حیات و ترقی کے لئے دُعا کر رہے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ لوگوں کو شرم آنی چاہیئے کہ تم میرے لڑکوں کو درازیٔ حیات کے لئے دست بدُعا ہو۔ تم کو تو اپنے ملک اور نوعِ انسان کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہونے کی دُعائیں کرنی چاہیں۔ میرے لئے میرے بچّے اتنے پیارے نہیں ہیں جتنے اللہ کی ساری مخلوق۔ اگر میں خدا کی مخلوق کی بھلائی کے لئے دُعا کروں گی تو خدا میری اور میرے بچّوں کی مدد کریگا۔ میرے لڑکوں کے نظر بند ہوتے پر بہت سے لوگوں نے مجھ سے کہا کہ "تم نے اپنے لڑکوں کو ایسی راہ پر کیوں لگا دیا؟ میں نے جواب دیا" وہ لوگ جیل نہیں گئے ہیں۔ بلکہ آزادی و نجات کے راستے پر جا لگے ہیں"۔

غدر کے زمانے میں ہندوستانیوں نے اپنی مرضی سے ہندوستان کو انگریزوں کے حوالے کر دیا تھا۔ اس لئے حکومت برطانیہ کا فرض تھا کہ ہندوستان کی حالت سُدھارے لیکن لوگ خود غور کر سکتے ہیں کہ سو برس قبل ہندوستان کی کیا حالت تھی اور آج کیا حالت ہے؟ اس پر طرہ یہ ہے کہ اگر موجودہ نظام حکومت کے خلاف ہم احتجاج کرتے ہیں تو ہم جیل بھیج دیئے جاتے ہیں۔ لوگ فاقہ سے مر رہے ہیں اور مُلک تباہ ہو رہا ہے، اگر ہم شکایت کرتے ہیں

تو ہم پر تشدد کی گرم بازاری ہوتی ہے۔ جب میں نے مُلک کی یہ حالت دیکھی تو اپنا فرض سمجھا کہ، اپنے لڑکوں سے یہ کہوں کہ بیٹے اپنے عیش و راحت کا خیال مت کرو بلکہ دوسروں کو مصائب سے نکالنے کے لئے اپنی زندگی کو وقف کردو۔ اس کے بعد محمد علی نے دو اخبار نکالے۔ ایک انگریزی میں اور دوسرا اُردو میں۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد اخبارات بند کر دیئے گئے اور ضمانت ضبط کر لی گئی۔ ہزاروں روپے ضائع ہوئے لیکن وہ بھی کافی نہ ہوا اور دونوں بھائی جیل بھیج دیئے گئے۔ جہاں جہاں وہ لوگ گئے، میں بھی ساتھ گئی۔ میرے اپنے احباب اور رشتے دار مجھ سے کہا کرتے تھے کہ اپنے لڑکوں کی زندگی کیوں برباد کر رہی ہو؟ ایسی زبردست حکومت کے خلاف یہ لوگ کیا کر سکتے ہیں۔

میں نے جواب دیا کہ "ہاں! وہ لوگ زبردست حکومت کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے، لیکن خدا نے مجھ کو خربزہ کے دو بیج عطا کئے ہیں، جن کی میں نہایت احتیاط سے پرورش و پرداخت کروں گی اور خدا کی عنایت سے یہی عظیم الشان بیل کی طرح پھیل جائیں گے۔ اور ان سے نئی نئی بیلیں پھوٹیں گی۔ فارسی میں ایک مقولہ ہے" خربزہ از خربزہ رنگ بگیرد" خدا کا شکر ہے کہ میری پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی۔ اور آج اُسی مقصد کے لئے لاکھوں آدمی لڑ رہے ہیں۔ پانچ سال کی قید و بند کے بعد ۱۸ ماہ تک میرے لڑکے آزاد رہے" اس کے بعد ہی گرفتار کر لیئے گئے۔ جب میں نے یہ خبر سُنی، اس وقت میں سخت بخار میں مُبتلا تھی۔ اور سفر کرنے سے سراسر قاصر تھی۔ لیکن میں نے خدا سے دُعا کی اور خدا نے مجھے اتنی قوت بخشی کہ تیسرے ہی دن کراچی پہنچی۔ میں نے راستے میں سُنا کہ ہزاروں ہندو اور مسلمان بہ چشم پُرنم مجھ ہی کو ڈھونڈھ رہے ہیں۔ جب میں لوگوں سے ملی تو میں نے ان سے کہا کہ اگر محمد علی و شوکت علی

گرفتار ہو گئے تو رنج و غم کی بات نہیں ہے۔ میں نے اپنا نقاب اُٹھا دیا اور کہا دیکھو میں تمہاری اماں ہوں۔ ان کو جیل جانے دو، کچھ غم نہ کرو اگر وہ جیل جا رہے ہیں تو اس میں غم کی کیا بات ہے۔ میں تم سب کو اپنا لڑکا تسلیم کرتی ہوں۔ اس روز سے میں کام کر رہی ہوں اور ہندوستان کے تمام بچوں کو اپنا بچہ تصور کرتی ہوں، جب میرے لڑکے جیل کا لباس پہن چکے تھے تو میں اُن کے پاس گئی اور اُن سے کہا کہ اگر میں تمہیں دیکھوں تو گھر کی آسائش و آرام کو یاد کر کے افسوس نہ کرنا۔ اگر تم نے کسی قسم کی کمزوری ظاہر کی تو سمجھو کہ تم میرے بچے نہیں ہو" اس وقت سے بجائے افسوس کرنے اور وقت ضائع کرنے کے برابر کام کر رہی ہوں۔ ابھی چند ہفتہ ہوئے، کہ علی برادران جیل سے آئے ہیں، اُن کی عدم موجودگی میں اُن کی جگہ پر میں کام کرتی رہی۔

سپاہی کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی بات نہیں کہ جنگ کرتے ہوئے مارا جائے۔ میں نے علی برادران کی سوانح عمری اس لئے نہیں بیان کی ہے کہ اپنی تعریف سُن کر محظوظ ہوں، بلکہ میں نے مثال پیش کی ہے، اور آج تو سارے ہندوستان کی عورتوں نے یہی رویہ اختیار کیا ہے۔ خواتینِ ہند نے پبلک پلیٹ فارم سے اعلان کر دیا ہے کہ ہم ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار ہیں۔ وہ جیل جانے پر بھی راضی ہیں۔ میں تمام خواتین سے بلا امتیازِ مذہب و فرقہ اپیل کرتی ہوں کہ آئندہ نسلوں کی بھلائی کے لئے دوش بدوش کام کریں۔

ہندوستان روز بروز غریب ہو رہا ہے، ہم کامل آزادی چاہتے ہیں، ہم ہندوستان میں سوراج چاہتے تھے۔ اگر حکومت نے سوراج نہیں دیا تو ہم خلاف ورزی قانون شروع کر دیں گے۔ اردو کا ایک محاورہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی انسان دھکیل کر گوشے میں پہنچا دیا جاتا ہے تو ان کے لئے سوا اس کے کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ کھڑا ہو کر جنگ کرے۔ آج لوگ تباہ ہو رہے ہیں، اُن کے مکانات برباد کئے جا رہے ہیں، عورتوں نے اپنے شوہروں سے، بہنوں نے اپنے بھائیوں

ہے اور ماؤں نے اپنے لڑکوں سے کہہ دیا ہے کہ مُلک و مذہب کی خاطر جیل بھر دو، ہم اس پر تیار ہیں کہ پہلے کی طرح امن و صُلح کے ساتھ رہیں۔ لیکن شرط یہی ہے کہ ہمیں سوراج مل جائے۔ ہمیں سوائے خدا کے کسی کا خوف نہیں ہے۔ میں ایک نیک عورت ہوں لیکن میرے دل میں ایک آگ سُلگ رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج میں پاگل کی طرح تمام طرف دوڑ رہی ہوں اور لوگوں کو اپنے فرائض سے آگاہ کر رہی ہوں۔ اور میں اس وقت تک اطمینان سے نہیں بیٹھوں گی جب تک کہ میرے دل کی جلن نہ کم ہو۔ میں بوڑھی ہوں اور آج کل کی مہمان ہوں لیکن میں ہر وقت یہی دُعا کرتی رہتی ہوں کہ خدا اہلِ وطن کو ہمّت اور حُبّ الوطنی عطا کرے۔ میں نے مُلک کے ایک زبردست انقلاب کو دیکھا ہے۔ جب میں سات سال کی تھی تو غدر ہوا تھا۔ اب میں خدا سے دُعا کرتی ہوں کہ دوسرا انقلاب بھی دیکھ لوں۔ یعنی سوراج میری حیات میں مِل جائے۔

میں کسی عورت کو کسی اور کپڑے میں اتنا خوبصورت نہیں دیکھتی ہوں جتنا کہ کھدر میں۔ تمام عورتوں پر فرض ہے کہ غیر مُلکی کپڑے کو استعمال کرنے سے شرمائیں اور کھدر کی تبلیغ و اشاعت میں کسی طرح کی فروگذاشت نہ کریں۔ کھدر پر مُلک کی نجات کا دارومدار ہے۔ (پیام کلکتہ ۱۱ر جنوری ۱۹۳۱ء)

—x—

بولیں امّاں محمّد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
— شاعر

۱۹۰۷ء کا ایک ورق

(مولانا محمد علی جوہر)

ذیل میں رئیس الاحرارؒ کے ایک نایاب مضمون کا اردو ترجمہ درج کیا جاتا ہے، یہ مضمون مولانا مرحوم کی کتاب "تھاٹس آون دی پریزنٹ ڈس کانٹنٹ" میں شامل ہے۔ یہ کتاب ۱۹۰۷ء میں بمبئی گزٹ اسٹیم پریس میں طبع ہوئی تھی اور اسی زمانے میں ہاتھوں ہاتھ نکل گئی تھی اور جو چند نسخے باقی تھے وہ اس زمانے میں فروخت ہو گئے جب دہلی سے "کامریڈ" اور "ہمدرد" نکل رہے تھے۔ اب یہ کتاب بالکل نایاب ہے۔

اگر ایک اور یورپین اس دل خوش کن بات کو قبول کرلیتا ہے کہ میں سیاسی لحاظ سے افضل ہوں تو پھر اس کے اُن قدموں کا کھوج لگانا دشوار نہیں ہوتا جن کو اٹھا کر وہ ان نتائج پر جا پہنچتا ہے جو ایشیائی کے لئے نفرت انگیز ہوتے ہیں اور جن پر وہ جوش میں آکر یورپین کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور چیلنج دینے لگتا ہے۔ مگر یورپین قدرتی طور پر ان کلوں کی نسبت جن کے ذریعہ سے وہ اس بلند مقام پر پہنچ گیا ہے، یہ سمجھتا ہے کہ وہ کلیں ہمیشہ ہمیشہ مشرق کیلئے ناموزوں رہیں گی۔ اور مشرق سیاسی خودمختاری کی اہلیت اور صلاحیت ہی نہیں رکھتا اور نمائندہ ادارے جو یورپ کے لئے غذا کی حیثیت رکھتے ہیں وہ ایشیا کے لئے سم قاتل ہیں۔ لہٰذا اگر عوام کے مطالبات کو پیش نظر رکھ کر کوئی بھی رعایت کی جائے تو وہ اس وجہ سے کی جانی چاہیئے کہ ایشیائی لوگوں کی چیخ و پکار دب جائے جس طرح روتے ہوئے بچوں کو

کھلونے دے کر بہلا دیا جاتا ہے۔ یورپین اقوام اس کی قائل نہیں ہیں کہ نمائندہ ادارے ہز سوئٹزر کے اس پار مفید ہو سکتے ہیں۔ مگر اس امر پر غور کرنے سے حیرت ہوتی ہے کہ یورپین اقوام تعلیم کی طاقت پر کس قدر کم عقیدہ رکھتے ہیں۔ اور انسان کی خلقی و موروثی کمزوریوں کے کس قدر زیادہ قائل ہیں۔ جب تاریخ کے صفحات اُن کے سامنے الٹے جاتے ہیں تو بھی وہ نہیں دیکھ سکتا کہ جو صدمایں گزر جاتی ہیں، وہ زمانہ کے سطح سمندر پر محض موجوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کیا پرانی تہذیبوں نے اس قدر سرکشی کے ساتھ ان لوگوں کا استہزا نہیں کیا تھا جو اس زمانہ میں وحشی خیال کیئے جاتے تھے، تاہم انھیں وحشی لوگوں نے قدیم تہذیبوں کو مغلوب و عاجز بنا دیا اور موسیقار کی طرح اپنی ہی راکھ سے ازسرنو پیدا ہو گئے جو سیاست داں سمجھتے ہیں کہ نمائندہ ادارے مشرق کی روح اور ذہنیت کے منافی ہیں۔ ان لوگوں کو یہ یاد دلانا بیجا نہ ہوگا کہ وہ ہندوستانی جس کو یورپین سیاست داں ایک مفکر اور قائد کہکر مسرور ہوا کرتے تھے اور جو ہماری تعلیم جدید کی ایک نیم پختہ پیداوار نہ تھا کہ نیم ساختہ اور خام خیالات کا حامل ہوتا۔ بلکہ جو جدید و قدیم دونوں اقسام کی چیزوں سے واقف تھا اور جس نے جان بوجھ کر اپنے تئیں قدیم چیزوں سے علحدہ بھی کر لیا تھا۔ اور جس نے پرانی دنیا سے اپنے رشتہائے تعلق کو محض اس خیال سے منقطع کر لیا تھا کہ نئی زندگی بخشنے والی ممبروں کے ساتھ حرکت کر سکے۔ جس کا نام سر سیّد احمد خاں تھا۔ اور جو وفاداروں کا وفادار تھا۔ اس جیّد اور ممتاز ہندوستانی نے غدر کا الزام ان لوگوں پر عائد کیا تھا جنھوں نے والیسرائے کی لیجلیٹو کونسل میں ہندوستانیوں کو براہ راست نمائندگی دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اس جیّد اور ممتاز ہندوستانی نے مطالبہ کیا تھا کہ اس اصول کو سلطنت کی سیاست میں وسعت دی جائے۔

جب وہ خود وائیسرائے کی لیجلیٹو کونسل کا ممبر ہوا اور ایک موقعہ پر اس جماعت میں سنیٹرل پراونسیس سیلف گورنمنٹ بل (مسودہ قانون حکومت خود

مختاری صوبجات متحدہ) پر بحث ہو رہی تھی تو اس نے کہا تھا کہ میں مسرور ہوں کہ میں
ابتک زندہ ہوں اور دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستانی اپنے حاکموں سے حکومت خود
مختاری کے وہ سبق پڑھ رہے ہیں جس نے اقوام عالم کی صفوں میں برطانیہ عظمیٰ کو
اسقدر شاندار بنا دیا ہے، لہٰذا اگر آج سر سیّد احمد خاں کی ۱۸۸۳ء والی یادگار
تقریر سے چوتھائی صدی کے بعد ہندوستان کی سیاسیات میں اس اہم اصول کو
استعمال کیا جاتا اور صرف اسی وجہ سے استعمال نہیں کیا جاتا کہ اس نعمت کا مطالبہ
کرنے والوں میں بعض رو رو کر لجاجت کرنیوالے اور گڑگڑانے والے بابو بھی
شامل ہیں تو یہ ایک نہایت عجیب بات ہے۔ برک اور امریکن ٹیکز لیشن کے وقت
سے اسوقت تک برطانیہ عظمیٰ کی سلطنت کے سامنے جو معاملات درپیش
ہوئے ہیں اُن میں سب سے زیادہ نازک معاملے کا تصفیہ مسٹر مارلے نے کر دیا ہے
اور انھوں نے جو تصفیہ کیا ہے وہ اپنے پیشرو اعظم کی حقیقی معتدلانہ تاہم سنجیدہ
اسپرٹ میں کیا ہے، ہندوستان کے آئینی مجالس کو جو وسعت دی گئی ہے اور
احرار کی جو مجلس قائم ہوئی ہے اور پھر انھوں نے خود اپنی مجلس کے لئے ایک دو
ہندوستانیوں کا جو انتخاب کیا ہے وہ حقیقتاً صحیح سمت میں چند قدم ہیں، اگرچہ نہایت
ضروری تفاصیل کی نسبت بھی ابتک بہت ہی کم علم حاصل ہو سکا ہے۔ بہرحال اگر
جہاز کا رخ صحیح سمت میں ہے تو رفتار کے متعلق چنداں مضائقہ نہیں، لہٰذا جو
خاص اہم سوال ہے وہ یہ ہے کہ مسٹر مارلے نے جو قدم اٹھائے ہیں اُن کا رخ خوش
اسلوب حکومت کی طرف ہے یا حکومت خود اختیاری کی طرف، اگر یہ سوال
انگریزوں کی سی اسپرٹ میں طے ہو جائے تو رفتار کو اسی حال پر چھوڑا جا سکتا
ہے۔ اور اگر واقعہ یہ ہے کہ جہاں بہترین گھوڑے بھی کاہل و قامر ہوں، وہاں
سست رفتاری میں ہی سلامتی ہو سکتی ہے۔

(الامان ۱۹ رفروری ۱۹۳۱ء)

رئیس احرار کے دو عدیم النظیر جلوس

۱۹۱۹ء کا پہلا تاریخی جلوس

آج سے تقریباً گیارہ سال قبل چھنڈواڑہ کی نظر بندی سے رہائی کے بعد رئیس الاحرار مولانا محمد علی صاحب نے امرتسر کانگریس میں شرکت کی اور وہاں سے واپسی پر آپ دہلی تشریف لائے۔ دہلی شہر جو آج زعیم الملت کی جدائی میں سوگوار ہے۔ اس دن دلہن بنا ہوا تھا اور اس کی فضا آمد آمد کی نغمہ سنجیوں سے گونج رہی تھی۔ گھر گھر خوشی تھی اور گھنٹہ گھر پر الیس۔ الیس۔ برٹی جہاز تیار ہو رہا تھا۔ استقبال کی تیاریوں میں ہندو۔ مسلمان۔ سکھ۔ پارسی غرض تمام اقوام غرق تھیں۔

باشندگان دہلی مسرور تھے۔ قوم کے سردار جو ۱۹۱۴ء میں جدا کئے گئے تھے پھر اپنے دیدار سے انھیں مشرف کرنے والے ہیں اور خاک دہلی فدا کارانِ اسلام کے قدوم سے پھر معزز ہو گی۔ تین یوم پہلے چاندنی چوک میں عظیم الشان [illegible] کی تعمیر شروع ہو گئی تھی۔ ہر کوچہ پر دروازے علیحدہ علیحدہ بنائے گئے [illegible] کیا چہل پہل تھی۔ تمام شہر کی آئینہ بندی کی گئی تھی۔ چاندنی چوک [illegible] ڈی بازار، سرکی والان، صدر بازار کے دونوں طرف جھنڈیاں آویزاں تھیں۔ بیرقیں لگی ہوئی تھیں اور دوکانیں آراستہ تھیں۔

زندہ باد محمد علی

زندہ باد شوکت علی

اور کہیں "خادم کعبہ زندہ باد" کے کتبے آویزاں تھے۔ دریبہ کلاں کے دروازے پر حسب ذیل

قطعہ لکھا تھا۔

شکر خدا کہ قوم کے سردار آگئے
صبر و رضا کے مالک و مختار آگئے
کہتا ہے شوق دیکھ کر شمس و قمر کا نور
یوسف کی طرح چھٹ کے گرفتار آگئے

چاندنی چوک میں ایک دروازے پر کسی نے کیا خوب شعر لکھا تھا ؎

اظہار شانِ دین محمد علی سے ہے
اسلام کی جو پوچھو تو شوکت علی سے ہے

تین تین سو، چار چار سو میل کی مسافت طے کر کے محمد علی کے دیدار کی خاطر مسلمان دہلی میں آگئے تھے۔ بکثرت والنٹیر کوریں اسلام کے اس سپہ سالار کے استقبال میں شرکت کرنے کے لئے تیار کی گئی تھی۔

جس دن رئیس الاحرار دہلی پہنچے۔ ایس۔ ایس۔ لبرٹی پر آپ کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا گیا، جس وقت آپ نے ایڈریس کا جواب دیا تو اسلامی جھنڈا جس پر ہلال کا نشان تھا اڑایا گیا۔ اکتیس ۳۱ گولوں کی سلامی دی گئی۔ گھنٹہ سے فتحپوری تک تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ مکانوں، دوکانوں، کوٹھوں، سڑک کے دونوں طرف لاکھوں کی تعداد میں افراد جمع تھے۔ نو ۹ بجے جلوس اس شان سے روانہ ہوا کہ سب سے آگے بینڈ باجا، نفیری والے، شہنائی والے، کٹورے والے، پیدل رضا کاروں کا دستہ، جودھپوری وردی میں سوار رضا کاروں کا رسالہ، ترکی پوشاک میں سوار رضا کاروں کا رسالہ، پھر پیدل [illegible]ں کا دستہ، اس کے بعد اعزازی دستہ، اور پھر مولانا کی گاڑی تھی [illegible] کے [illegible] رضا کاروں کا دستہ، اور پھر خلقت کا اژدھام وغیرہ وغیرہ، سڑکوں [illegible] دو [illegible] رضا کاروں کی صفیں کھڑی تھیں سواری پر پھولوں کی بارش ہو رہی تھی۔ کئی مقام پر چاندی کے پھول نچھاور کئے گئے۔ تھوڑی تھوڑی دور کے بعد پھولوں کے ہار گجرے اور

تحائف پیش کئے جا رہے تھے۔

جلوس جمعہ کی نماز کے لئے جامع مسجد پر ختم ہوا۔ لاکھوں غلامانِ محمد الرسول اللہ پہلے سے اس جگہ بھی جمع تھے۔ رئیس الاحرار نے دوگانہ ادا کیا اور جمعہ کی نماز پڑھی۔ مختصر تقریر کی، اس کے بعد جلوس پھر روانہ ہوا اور بڑے بڑے بازاروں میں گشت کرنے کے بعد فتحپوری پر ختم ہوا۔ اس جگہ مغرب کی نماز کے بعد زعیم الملت موٹر میں سوار ہوئے اور ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی واقع دریا گنج تشریف لے گئے۔ شب کو شہر میں چراغاں کی گئی اور تمام شہر کو بقعۂ نور بنا دیا گیا۔

دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ ایسا پر تپاک خیر مقدم اور گرمجوشی کا استقبال کسی بادشاہ کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔ کیونکہ اخلاص و محبت اور عقیدت کے جو سچے مناظر اس وقت دیکھنے میں آئے، آنکھیں شاید ہی انھیں دیکھ سکیں۔ یہ لاثانی استقبال جو مولانا مرحوم کو زندگی میں نصیب ہوا، ہندوستان کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ اور اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں کسی لیڈر کو نہ پہلے نصیب ہوا تھا اور نہ شاید اب نصیب ہوگا۔ اس کا سبب محمد علی کی خدماتِ وطن اور اسلام کے لئے سرفروشانہ جدجہد تھی، یا یوں سمجھئے کہ ان کی زندگی میں قبولیت عام اور محبت تام کا مظاہرہ تھا۔

دوسرا تاریخی جلوس

۱۹۱۹ء میں مولانا محمد علی کے استقبال کا مختصر حال پڑھ لیا۔ اب جگر تھام کے بیٹھئے کہ ۴ جنوری کو شب برات کے دن مجاہد اسلام مولانا محمد علی نے ہندوستان سے ہزاروں میل دور لندن میں اسلام اور ہندوستان کی خاطر جنگ کرتے ہوئے اپنی جان قربان کر دی (رحمتہ اللہ علیہ) آؤ! اب اس استقبال کی شان دیکھیں جو حیات ابدی حاصل کرنے کے بعد مولانا کے

جسدِ اطہر کا لندن سے بیت المقدس تک کیا گیا۔

لندن میں انتقال کے بعد وزیر اعظم کا نمائندہ، وزیر ہند، لارڈ سینکے، لارڈ چانسلر، ہز ہائینس نواب بھوپال، مہاراجہ الور، دیگر والیان ملک، سر اکبر حیدری نمائندہ حضور نظام اور مندوبین لندن کانفرنس، شاہ افغانستان کے برادر ہز رائل ہائینس شاہ ولی خان، سفیر حجاز، سفیر عراق، سفیر ایران، سفیر مصر نے جنازے میں شرکت کی۔ تعزیتی خطوط لکھے، اخبارات میں ماتمی مضامین شائع ہوئے، ملّتِ اسلامیہ پر غم کے بادل چھا گئے۔ مسلمانوں کے دل ٹوٹ گئے۔ ہندوستان غم میں ڈوب گیا۔ مصر، فلسطین، عراق، بربر، طرابلس، ان کے احسانات کو یاد کر کے ماتم کناں۔ غرضیکہ ممالک اسلامیہ کا ذرہ ذرہ نوحہ کرنے لگا۔ فلسطین کے مفتی اعظم نے درخواست کی اس شہید اسلام کو اس کے رتبے کے مطابق حرم شریف میں دفن کیا جائے۔ محمد علی کے دل میں مسلمانوں کا درد تھا۔ یہ امانت ارضِ مقدس کے سپرد کی جائے غرضیکہ پیغمبروں کی سرزمین محمد علی کی آخری آرام گاہ قرار پائی ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

۲۱ جنوری کو جنازہ ائرپورٹ سعید "وائسرائے آف انڈیا" جہاز سے پہنچا۔ یہاں ماتم گساروں کا اجتماع عظیم بطل جلیل کو آخری الوداع کہنے کے لئے موجود تھے۔ جہاز سے تابوت بحری فوج نے اعزاز کے ساتھ اٹھایا۔ مصر کی شاہی پولیس و رسالہ نے سلامی لی۔ جامعہ عباسیہ میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ اس کے بعد فوج اور پولیس کی گارڈ کے ساتھ جنازہ ایک خاص ریلوے سیلون میں رکھا گیا۔ جلوس میں شاہ فواد کے نمائندے، وزیر اعظم مصر کے نمائندے اور شہزادہ عمر طوسون، شہزادہ محمد علی، شہزادی عفت حسن خانم اور صاحب دولتہ نحاس پاشا، سابق وزیر اعظم مصر اور مصری بحری فوج کا رسالہ اور تقریباً پچاس ہزار مسلمانوں نے شرکت کی، شہزادہ محمد علی کی جانب

سے غلاف کعبہ شریف کا پورا ٹکڑا تابوت پر پھیلا دیا گیا۔ حزب الاحرار کی جانب سے محمد محمود پاشا سابق وزیر اعظم مصر و لیڈر پارٹی مذکور نے علالت کے باعث شرکت نہ کی مگر برقی پیغام تعزیت ارسال کیا۔

ینگ مین مسلم الیوسی ایشین کی جانب سے شیخ عبدالوہاب آفندی، ملک الشعراء مصر بطور نمائندہ القدس کو روانہ ہوئے۔

جنازہ ہائی کمشنر فلسطین کی خاص گاڑی میں جو اسی غرض سے دی گئی تھی۔ رکھا گیا اور اَللّٰہُ اَکبَر کے فلک شگاف نعروں کے درمیان گاڑی ارضِ پاک کی جانب روانہ ہوئی۔

تدفین میں شرکت کے لئے مصر کی جانب سے احمد کمال پاشا گورنر نہر سوئز، بحیثیت نمائندہ ہز مجسٹی شاہ مصر، کامل سلیم بے نمائندہ وزیر اعظم مصر، احمد ذکی پاشا، عبدالحمید سعید بے، مرزا مہدی بے رفقی، شیخ رفقی بے اور ہز ہائینس محمد علی پاشا اسی اسپیشل ٹرین سے بیت المقدس روانہ ہوئے۔

عمان (دارالسلطنت شرق اردن) سے شیخ عبدالسراج سابق چیف جسٹس حجاز نے ہز مجسٹی شاہ حسین کی نیابت کرتے ہوئے شرکت کی اور شاہ شرق اردن کی جانب سے شیخ فواد خطیب وزیر خارجہ نے شرکت کی۔

۱۸ر جنوری کو فلسطین کی جانب سے ایک وفد پورٹ سعید پہنچ گیا تھا۔ استقبال جنازہ کے انتظامات جمعیۃ شبان المسلمین فلسطینی کے نوجوان عربوں پر مشتمل ہے اور مسلم سپریم کونسل کے بعد سب سے بڑی معتدر جماعت ہے۔ چنانچہ سید جمال الحسینی معتمد مسلم سپریم کونسل و دیگر عہدہ داران جمعیۃ شبان المسلمین نے مصری وفد کے ساتھ مل کر پورٹ سعید پر جنازے کا استقبال کیا۔

اس کے بعد جب جنازہ القدس کی جانب روانہ ہوا تو غازہ، جافا، لدوله، وادی سرار، ارطوف، لیطیر کے بڑے بڑے شہروں

پر اسپیشل ٹرین ٹھہرائی گئی۔ ہر اسٹیشن پر ہزاروں کی تعداد میں مسلمان گردو نواح کے اور دور مقامات سے جمع تھے، ہر اسٹیشن پر نماز جنازہ ادا کی جاتی تھی۔ اس امر کا انتظام کیا گیا تھا کہ سوائے "اَللّٰہُ اَکْبَرُ" کے اور کسی قسم کا نعرہ نہ لگایا جائے، چنانچہ جب گاڑی کسی اسٹیشن پر پہنچتی تو اس کی آمد اور روانگی کے وقت نعرہ بلند کیا جاتا تھا۔ اور بس ہر طرف سناٹا اور خاموشی۔ نماز جنازہ کے بعد باآواز بلند تلاوت قرآن مجید اور فاتحہ خوانی کی جاتی تھی۔ ان تمام مقامات سے انتظام کیا گیا تھا کہ اسپیشل ٹرین میں پانچ پانچ آدمیوں کا وفد سوار ہو اور جو تدفین میں شامل ہو۔

پورٹ سعید سے القدس تک وطوے تک خاص انتظامات کئے تھے اور ہائی کمشنر کے احکامات کی بنا پر تمام گاڑیوں کی آمد بند کر دی گئی تھی۔ شہر بیت المقدس اور فلسطین کے تمام دیگر شہروں میں کاروبار بند کر دیا گیا تھا اور اعلان کر دیا گیا تھا کہ تدفین کے مقررہ تمام فلسطین میں پانچ پانچ منٹ تک خاموشی اختیار کی جائے۔

آخر کار "القدس" پر ۱/۲ ۹ بجے صبح ٹرین پہنچی۔ اسٹیشن پر تمام مذہبی پیشوا، سرکاری حکام، زعما فلسطین، طیولنس، طرابلس، بربر اور دیگر ممالک اسلامیہ اور فلسطین کے دیگر شہروں کے نمائندگان موجود تھے۔ اور اسٹیشن سے باہر لاکھوں کی تعداد میں مسلمان اور عیسائی ویہودی جلوس وجنازہ میں شرکت کے لئے موجود تھے۔

بیت المقدس میں جنازہ گاڑی سے اتارا گیا۔ اس کے چاروں طرف علماء مصر، مصری وفد کے نمائندگان، شاہ حسین کے نمائندے اور عبداللہ شاہ شرق اردن (یردن) کے نمائندہ، سلطان فواد شاہ، مصر کے نمائندے اور مسلم سپریم کونسل کے اراکین موجود تھے۔

ان کے بعد غیر ملکی سلطنتوں کے نمائندے، گورنمنٹ کے نمائندے

اور دیگر ممالک عرب کے مندوب اور اعیان فلسطین کا گروہ موجود تھا، پھر عرب کے مندوب اور اعیان فلسطین کا موجود تھا، پھر عرب لیبر یونین اور دیگر انجمنوں کے اراکین، اس کے بعد ہزارہا کی تعداد میں دیگر شرکاء جنازہ . . . . جنازہ کے آگے مولانا شوکت علی صاحب، مفتی اعظم فلسطین، سابق سلطان ترکی کے شہزادے ذکی پاشا، شہزادگان مصر اور ان کے نمائندے۔

ان کے آگے سوار پولیس کا رسالہ، اس کے بعد انجمن شبان المسلمین کے اراکین مولانا مرحوم کی تصویر لئے ہوئے تھے، پھر بینڈ باجا جو ماتمی گت بجا رہا تھا اور بوائے اسکاؤٹ۔

سڑک کے دونوں طرف فوج اور پولیس کے دستے صفیں باندھے کھڑے تھے جنازہ کے ساتھ فلسطین کا نشان قومی اور مختلف قسم کے کتبات جن پر آیات قرآنی تحریر تھیں۔

جنازہ کا جلوس صخرا کے دروازہ پر پہنچا تو مفتی اعظم اور مولانا شوکت علی صاحب کی خدمت میں حکومت فلسطین کے نمائندوں نے اور غیر ملکی سفرا نے نیز عیسائیوں کے مندوبین نے تعزیت پیش کی۔

اس کے بعد جنازہ قبۃ الصخرا میں داخل ہوا، جہاں پر نماز جمعہ سے قبل قرآن خوانی ہوئی۔ نماز جمعہ اور نماز جنازہ میں شرکت کے لئے اس مرتبہ ہزارہا مسلمان بیرون فلسطین سے پہنچ گئے تھے۔ نماز جمعہ کے بعد نماز جنازہ تقریباً دو لاکھ مسلمانوں نے ادا کی۔

نماز جنازہ کے بعد ممبر حضرت عمر پر کھڑے ہو کر سب سے پیشتر مفتی اعظم فلسطین نے، اس کے بعد ذکی پاشا نے، پھر مندوبین مصر، طیولنس، حجاز، عراق نے مولانا محمد علی کی خدماتِ ملّی اور زرّیں کارناموں کا تذکرہ کیا اور اسی جگہ پر نوجوان مسلمانوں نے آپ کے کاموں کو جاری رکھنے کے لئے قسم کھائی۔ بعدہٗ ہندوستان کی اس امانت کو قبۃ صخرا کی شمالی دیوار کے ایک حجرہ میں جو خاندان خطیب کی طرف سے

پیش کیا گیا تھا، ۴½ بجے شام سپرد خاک کر دیا گیا۔

تدفین کے بعد مولانا شوکت علی صاحب اور مفتی اعظم کی خدمت میں ممالک اسلامیہ اور دیگر اعیان و علماء اسلام نے تعزیت پیش کی اور اس طرح ہندوستان کے بطل عظیم، اسلام کے مجاہد کا آخری استقبال ختم ہوا خداوند کریم اُن پر رحم کرے اور انھیں جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے اور ان کی قبر کو نور سے منور کر دے۔ آمین۔

تدفین کے دوسرے دن صخرا شریف میں ایک زبردست ماتمی جلسہ منعقد کیا گیا اسوقت مسجد اقصیٰ کے ہر منارہ سے مؤذن تکبیر بلند کرتے تھے۔ اور آیت کریمہ

بآواز بلند تلاوت کرتے جاتے تھے۔

" ایک خبر "

لندن ۵ جنوری ۔ پیڈنگٹن ٹاؤن ہال میں مولانا محمد علی کے جنازے کی نماز ادا کی گئی۔ متعدد ہندوستانی طلبا اور دولتمند والیان ریاست صف در صف کھڑے تھے۔ آخر میں خواتین تھیں۔ جن میں بیگم صاحبہ محمد علی اور ان کی صاحبزادیاں تھیں۔ مولانا شوکت علی بھی سنہری کام کی عبا پہنے ہوئے موجود تھے۔ تابوت پر شیشے کا ڈھکنا تھا۔ نماز ووکنگ کی مسجد کے ہال میں ادا کی گئی۔ آخر میں مولانا... شوکت علی صاحب نے حاضرین سے درخواست کی کہ اس بہادر سپاہی کی مغفرت کے لئے ہر شخص اپنے عقیدے کے مطابق دعا کرے۔ وزیر اعظم کی طرف سے مسٹر ایس۔ کے براؤن (رکن دفتر وزیر ہند) اور لارڈ سنکے، مسٹر ویجوڈ بین اور مصری اور افغانی سفراء بھی موجود تھے۔

رائٹر کو معلوم ہوا ہے کہ ایک دن عام نماز جنازہ ہو گی۔ اس کے لئے دن اور وقت کا بعد میں اعلان ہو گا۔ مولانا کے اعزا جنازہ کے قریب رہینگے لاش میں خوشبو وغیرہ لگا دی گئی ہے، تاکہ ہندوستان لانے تک قائم رہے۔

(روزنامہ "ملت" مورخہ ۸ جنوری ۱۹۳۱ء)

کامل القادری

بیش بہا ماخذ

(ہم عصر جرائد کے جوہر نمبر)

مولانا محمد علی جوہر کی سوانح، شخصیت اور کارہائے نمایاں کا معروضی مطالعہ ابھی تک کسی صاحبِ قلم نے نہیں کیا ہے۔ اس میدان میں رئیس احمد جعفری اور افضل اقبال کی مساعی قابلِ قدر ہیں۔ انھوں نے مواد اکٹھا کرنے کی کوشش بھی کی ہے ـــــ اور خود بھی اردو اور انگریزی میں مولانا محمد علی کی زندگی اور جدوجہد پر مفصل کتابیں لکھی ہیں۔

بر این ہمہ ابھی تک، حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی ذاتی لائبریری میں مختلف اخبارات کے "جوہر نمبر" ہیں، اُن کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوا کہ مولانا محمد علی کی شخصیت موسمِ بہار کی بارش کے بعد رُونما ہونے والے اُس سلسلۂ قوسِ قزح سے مشابہ ہے جو یکے بعد دیگرے سینکڑوں کی تعداد میں تنا ہوا نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی ذاتی لائبریری میں کیسے کیسے لُولُو ولالہ ہیں، اس کا مجھے اندازہ نہیں۔ لیکن جس تحفۂ بیش قیمت سے اُنھوں نے مجھے نوازا ہے، اس کی تفصیل اور قدرے معروضی مطالعہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کی سوانح، شخصیت، صحافتی زندگی، شاعری، حسنِ خطابت، شعورِ مزاح اور سیاسی افکار و عملی سیاست میں حصّہ کے بارے میں اتنا مواد کسی کتاب میں نہیں جو اِن اخبارات کے صفحات پر بکھرا ہوا ہے۔

رسائل و جرائد کا ایک ریکارڈ مولانا محمد علی کی وفات کے بعد اُن خصوصی اشاعتوں اور عام پرچوں پر مشتمل ہے جو جنوری۔ فروری ۱۹۳۱ء کے دوران شائع ہوئے اور یہ ہم عصر تحریری ریکارڈ ہونے کی حیثیت سے نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔

آئیے اب اِن ماخذ پر نظر کریں، جن کو پڑھے بغیر مولانا محمد علی جوہر کی ذات و صفات کا اِدراک کیا جانا ممکن ہی نہیں۔

"تحریک پاکستان" میں اُن کا نام نہیں لیا جاتا لیکن یہ حقیقت ناقابلِ فراموش ہے کہ تشکیلی اجتماع ۱۹۰۶ء سے اوّلیں قیدِ فرنگ تک وہ مسلم لیگ، کی تنظیم میں مصروف رہے۔ اور مرنے سے قبل اُنہوں نے "نظریۂ دو قومی" تصنیف فرمایا اور ببانگِ دہل کہا کہ ہندی مسلمان ایک قوم ہے، اقلیت نہیں۔

ہمدرد

شمارہ ۱۱ر مئی ۱۹۲۸ء = اداریہ کشکول گدائی، دوبارہ شائع کیا گیا، یہ اس سے قبل ہمدرد شمارہ ۲۷ر اپریل ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا تھا۔

خبروں میں "کیا ہندوستان سول نافرمانی کے لئے تیار ہے۔ سوبھاش چندر کی تقریر" نیتاجی پر کام کرنے والوں کے لئے توجہ طلب ہے۔

شمارہ ۲۰ر مئی ۱۹۲۸ء : صفحۂ اوّل پر ۲۰ر مئی ۱۹۲۶ء چھپا ہے، لیکن اداریہ اور دوسرے تمام صفحوں پر ۲۰ر مئی ۱۹۲۸ء درج ہے، اور یہی صحیح ہے کیوں کہ تقویم کی رُو سے ۲۹ر ذیقعدہ ۱۳۴۶ھ اسی تاریخ پر دلالت کرتا ہے۔ اہم مضامین میں مولانا کا مطول اداریہ "الوداع" ہے۔ پورا اداریہ اب تک کہیں بھی نقل نہیں ہوا۔ رئیس احمد جعفری صاحب نے بھی اس کے بعض حصص کو دانستہ حذف کر دیا ہے یا اُنھیں اصل فائل دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ دوسرا مولانا کا مضمون "رُخصت" ہے۔

یہ وہ شمارہ ہے جب عبد الماجد دریابادی روزنامہ "ہمدرد" سے وابستہ ہوئے۔ اور ان کے ساتھ انتظامی امور کی نگرانی کے لئے ظفر الملک بھی شریکِ سفر ہوئے۔ اس شمارہ میں "نئی زندگی" کے عنوان سے عبد الماجد دریابادی اور "نئی ذمہ داری" کے عنوان سے ظفر الملک کا مختصر مضمون شامل ہے۔

شمارہ ۲۸ جون ۱۹۲۸ : صرف صفحات ۸ - ۷ ہیں ۔

صفحہ ۸ - ۷ پر اختر شیرانی کا ایک "دلچسپ مضمون" درّہ دانیال کا تاریخی محاصرہ اور دول متحدہ کی یادگار شکست (عظمتِ ترکی کا ایک فراموش شدہ افسانہ) شامل ہے ۔

خبروں میں "بردول کی چشم دید واقعات - مولانا حسرت موہانی کی تائید" مولانا حسرت پر کام کرنے والوں کے لئے توجہ طلب ہے ۔

شمارہ ۱۲ جولائی ۱۹۲۸ : صفحات ۱۵، ۹ و ۸ و ۷ " مذاکرات و مباحث" کے مستقل عنوان کے تحت "اسلام اور پردہ" پر محمد عبدالحق صاحب بی-اے ایل-ایل بی ایڈوکیٹ سہارنپور کا ایک عالمانہ مقالہ ہے ۔

شمارہ ۲۷ جولائی ۱۹۲۸ : صفحات ۱۵، ۹ و ۸ و ۷ و ۴، ۳، ۲، ۱ مولانا محمد علی کا اداریہ "الٹیمیٹم" عبدالماجد دریابادی کے شذرات کشکول' اور ایک مقالہ پردے کے حدود ۔

خبروں میں "خواجہ حسن نظامی کے خُسر کا قتل ۔ مقدمہ کا فیصلہ"

شمارہ ۱۰ جنوری ۱۹۲۹ : صفحات ۴، ۳، ۱ ۔ مولانا محمد علی کا مقالہ "روداد چمن" قسط اوّل' یہ وہ مقالہ ہے' جس میں مولانا نے اپنے عہد کے سیاسی مدوجزر کا معروضی مطالعہ پیش کیا ہے ۔ اس میں نہ صرف واقعات بلکہ تاریخ ساز شخصیتوں کے رُخ سے بھی نقاب اُٹھائی ہے۔

" ۱۳ جنوری ۱۹۲۹ : صفحات ۲، ۱ ۔ رودادِ چمن قسط دوم ۔

" ۱۴ جنوری ۱۹۲۹ : صفحات ۲ و ۱ ۔ رودادِ چمن قسط سوم ۔

" ۱۵ جنوری ۱۹۲۹ : صفحات ۶، ۵، ۴، ۳ رودادِ چمن قسط چہارم ۔

" ۱۲ اپریل ۱۹۲۹ : صفحات ۶ و ۵ و ۴ و ۳ مولانا محمد علی کا اداریہ "الوداع" جسے رئیس احمد جعفری نے "الوداع آخر" سے تعبیر کیا ہے ۔ یہ آخری شمارہ تھا۔ اخبار کو اس مرتبہ حکومت نے بند نہیں کیا بلکہ خریدار کی کمی اور ناقابلِ برداشت

"خسارہ" کی وجہ سے اخبار کو بند کر دینا پڑا۔ اس اداریے میں مولانا محمد علی نے ہمدرد کے عروج و زوال کی داستان نہایت معروضی انداز میں پیش کی ہے۔

خبروں میں "اخبار کی اشاعت" کے عنوان سے یہ ایک سطری خبر منیجر کی جانب سے چوکھٹے میں دی گئی ہے ــــ "نہایت افسوس کے ساتھ اعلان کیا جاتا ہے کہ "ہمدرد" کل سے شائع نہ ہو گا۔"

الامان

زعیم ملّت، زعیم الاُمّت، فقید المشرق، قائد اعظم، رئیس الاحرار مولانا محمد علی کا ماتم برِ صغیر پاک و ہند کے چپے چپے میں ہوا۔ مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی، اچھوت کون سا ایسا مذہبی گروہ اور فرقہ ہے جس نے تعزیتی پیغام نہ دیا اور کون سا ایسا شہر ہے، جہاں تعزیتی جلسہ منعقد نہ ہوا ہو ــــ ۱۹۳۰ء کی تین اہم سیاسی جماعتیں مسلم لیگ، ہندو مہاسبھا اور کانگریس نے بھی تعزیتی جلسے کیے۔ قرار دادِ تعزیت منظور کی۔ اور انفرادی طور پر بھی ان جماعتوں کے اُس وقت کے سربرآوردہ اراکین نے تعزیتی پیغام دیئے۔

برِ صغیر کے انگریزی، اردو اور دوسری زبانوں کے اخبارات نے خصوصی نمبر شائع کئے ــــ یہ سب تو ہمارے دسترس میں نہیں، جو خصوصی نمبر پیشِ نظر ہیں، اُن کے مندرجات یہ ہیں ــــ اور مولانا محمد علی جوہر ہی نہیں بلکہ اس تاریخ ساز عہد پر کام کرنے والوں کے لئے اُن کی اہمیت بے شک و لاریب ہے۔

"الامان" دہلی: اس روز نامہ کے مالک محمد مظہر الدین تھے۔ جلد ۱۲ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۹ فروری کو رئیس الاحرار نمبر" بیادگار شہید ملت مولانا محمد علی

نور اللہ مرقدہ' "شائع ہوا۔ سرِ ورق پر علامہ اقبالؒ' مولانا ضیا بدایونی' نہال سیوہاروی کے قطعات ہیں۔ نہال سیوہاروی کی نظم "آفتابِ مشرق کا غم" اور مرثیہ عربیہ (مع اردو ترجمہ) از مولانا ابو العلا عبداللہ السہاروی ہے۔

ص ۲ پر مولانا محمدؒ علی کے دو مضامین "آخری دعا" اور مرحوم دہلی کا مولانا محمد علی کی نگاہ میں" اور جذباتِ جوہر کے عنوان سے ان کی دو نعتیہ غزلیں ہیں۔

ص ۳ پر نہال سیوہاروی کی ایک اور نظم ہے۔ نیز دو مضامین "مولانا محمد علی عملی سیاسیات میں" از نوری اور مولانا محمد علی کی نایاب تصنیف ۱۹۰۷ء کا ایک ورق ہے۔

ص ۴ پر مولانا محمدؒ علی کے اس بیان کا اقتباس ہے جو انہوں نے مقدمۂ کراچی میں جیوری کے سامنے دیا تھا اور "جریدۂ فلسطین کا دل گداز ماتم" کے عنوان سے جریدۂ فلسطین کا مقالہ" افتتاحیہ ہے۔

ص ۵ پر سیّد محفوظ علی صاحب بی۔ اے علیگ بدایونی اور سیّد سردار علی صابری کانپوری کے لکھے ہوئے دو مقالے ہیں۔ محفوظ علی نے اپنے ذاتی تاثرات کو قلم بند کیا ہے۔ اور سردار علی صابری نے مولانا محمد علی کی شخصیت اور کارنامے کو" جہاتما   اور غازی انور پاشا" کی زندگی کے آئینے میں دکھایا ہے۔ اور ان تینوں شخصیتوں کا جائزہ لیا ہے۔

ص ۶ پر اداریہ "ماتمی عید" کے عنوان سے دیا ہے' جس میں مولانا محمدؒ علی کے کارناموں کا   اور سانحہ ارتحال پر اظہارِ تعزیت نہایت پُراثر الفاظ میں کیا گیا ہے۔ اور خبریں ہیں۔

ص ۷ پر خبریں ہیں۔

ص ۸ پر" رئیس الاحرار کے دو عدیم النظیر جلوس" کے عنوان سے ایک رپورٹ۔ القدس سے نامہ نگار" الامان" کی مرتب کردہ ہے۔

اور محمدؐ مظہر الدین کا مضمون " جہاز پر آنسوؤں کی بارش، بیگم صاحبہ مولانا محمد علی نے ساحلِ بمبئی پر کس طرح قدم رکھا ہے "۔

صفحہ ۹ پر خبریں ہیں ۔ مولانا شاہ محمد عبد الماجد قادری بدایونی کا تعزیت نامہ ہے ۔ اور مسٹر حبیب الرحمٰن دہلوی کا مرتب کردہ ایک گوشوارہ ہے، جس میں لندن میں مولانا محمد علی کی ساعتِ انتقال کے وقت دنیا کے مختلف شہروں میں اُس وقت کیا وقت تھا، دکھایا گیا ہے ۔

صفحات ۱۲ اور ۱۵ پر اشتہارات و خبریں ہیں ۔

بارہ صفحات پر مشتمل الامان کا رئیس الاحرار نمبر مولانا محمد علی جوہر کے ماخذ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جو اپنی پوری کیفیات کے ساتھ پہلی مرتبہ اس کے صفحات پر نظر آتی ہیں ۔

مدینہ بجنور

مدینہ بجنور کا " فقید الشرق محمد علی نمبر " پیشِ نظر ہے ۔ اس اخبار کے مالک محمد مجید حسن تھے ، اور ادارت میں نصر اللہ خاں عزیز بی ۔ اے (اسیر فرنگ) ، حامد الانصاری غازی (مدیر مسئول) اور حمید حسن (معاون) کا نام شائع ہوا ہے ۔ یہ نمبر ۲۵ جنوری ۱۹۳۱ء کو شائع ہوا ۔ " مدینہ بجنور " ہفتہ میں دو بار شائع ہوا کرتا تھا ۔ یہاں یہ واضح رہے کہ " مدینہ " اُن اخبارات میں شامل تھا جو ۱۹۲۸ء کے بعد مولانا محمد علی جوہر پر شدید تنقید اور نکتہ چینی کرنے میں پیش پیش تھے ۔

صفحہ اوّل پر " فلسفۂ موت و حیات " کے عنوان سے مولانا محمد علی جوہر کے کلام کا ایک ایسا انتخاب ہے جس میں انہوں نے موت و حیات کو موضوعِ سخن بنایا ہے ۔

صفحہ ۲ پر " ماتمِ جوہر " کے عنوان سے اداریہ ہے ۔ اور اپنے طرز کا

واحد اداریہ، اس میں اعتدال پسند محمدؐ علی، عدم تعاون محمدؐ علی شیر دل، بہادر، جنگجو اور سپاہی محمدؐ علی، ہندو مُسلم اتحاد کا بانی محمدؐ علی، وطن دوست اور رئیس الاحرار محمدؐ علی، صدر کانگریس محمدؐ علی، فلسفی اور دانش مند محمدؐ علی، اسلامی بین الاقوامیت کا حامی محمدؐ علی، مسلمان محمدؐ علی کے ذیلی عنوانات سے مولانا محمد علی کے اقوال کا نہایت عمدہ انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ یہ اداریہ صفحہ ۳ تک پھیلا ہوا ہے۔ اور صفحہ ۳ پر حامد انصاری غازی کی دُو نظمیں، "نغمۂ غم" اور "ماتم جوہر" بھی شائع ہوئی ہیں۔ ص ۴ پر غازی صاحب نے جوہر کی شاعری کا مختصر تعارف کرایا ہے اور ان کے کلام کا انتخاب دیا ہے۔

صفحہ ۵ پر تعزیتی پیغامات کو یکجا کر کے شائع کیا گیا ہے۔ اس میں دُو منظوم تعزیت نامے بھی ہیں۔ "اشکِ خونیں" کے عنوان سے خورشید آرا بیگم صاحبہ دخترِ قاضی محمدؐ قیام الدین صاحب امراوتی برار اور "صداقت کی شہادت ہے۔ یہ مرگِ ناگہاں تیری" کے عنوان سے سعید الحسن صاحب اور ہاشمی کانپوری کے قلبی جذبات پیش ہوئے ہیں۔

صفحہ ۶ پر "جوہرِ سیاست" کے عنوانات سے مولانا محمد علی کی بعض تقریروں اور تحریروں کے اقتباسات دیئے گئے ہیں۔

صفحہ ۷ پر مولانا قوس حمزہ پوری (گیا) مولانا سید عبدالوحید فدا، نواب محمدؐ تقی قمر گیاوی، مولوی محمد افضل صاحب شاہ اجمل الٰہ آباد اور مولوی محمدؐ حسن صاحب شوق جہاں پوری کے قطعاتِ تاریخ اور مراثیِ جوہر ہیں۔ راغب احسن صاحب کا بھی ایک تاثراتی مضمون "فقیدالشرق والسلام حضرت مولانا محمد علی جوہر زندہ ہیں" کے عنوان سے درج ہے۔

صفحہ ۸ پر مولانا محمدؐ منظور صاحب فاضل اجار الٰہ آباد، اور مولانا سید محمد یوسف صاحب پشاوری جامعہ جامع اسلامیہ ڈابھیل کا تعزیتی مضمون ہے۔

صفحات ۱۲، ۱۱، ۱۰ اور ۹ پر اشتہارات، خبریں، اور دیگر چیزیں ہیں۔
اس نمبر میں ایک ورق بطور ضمیمہ بھی شامل ہے، جس میں مولانا عبدالرزاق نے مختصر سوانح حیات لکھی ہے، اور گول میز کانفرنس کے آخری اجلاس میں وزیرِاعظم کی تقریر اور اعلان نامہ کو پیش کیا گیا ہے۔

اس نمبر کے علاوہ مدینہ بجنور، کا نمبر ۵ جلد ۲۰ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۳۱ء میں بھی مولانا محمد علی کے بارے میں چند اہم مضامین شائع ہوئے ہیں۔ نیز صفحہ ۸ پر قتل ساندرس کے مقدمہ کی رُوداد اہم ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس سے قبل مورخہ ۱۳ جنوری ۱۹۳۱ء کا "مدینہ" بھی ہے، جس میں مولانا کی وفات کے بعد برِّ صغیر پاک و ہند میں جو ہڑتالیں، تعزیتی جلسے، ماتمی جلوس اور رہنماؤں کے اظہارِ الم کی رُوداد شائع ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بمبئی، کلکتہ، دہلی، امرتسر، احمد آباد، بنگلور، مدراس، مراد آباد، پونا، رنگون، علی گڑھ، آگرہ، سورت، بلگام، لائل پور، لدھیانہ، راولپنڈی، بجنور، میں مولانا محمد علی کے سوگ میں کاروبار بند رہا اور تعزیتی جلسے اور جلوس نکالے گئے۔ اسی شمارہ کے صفحہ ۲ پر ملت دہلی، ہمت لکھنؤ، الجمعیۃ دہلی، انقلاب لاہور، سیاست لاہور، کے اُن اداریوں کے اقتباسات بھی شائع ہوئے ہیں۔ جوان اخباروں نے مولانا محمد علی کی وفات پر لکھے تھے۔

مدینہ بجنور کا ۵ جنوری ۱۹۳۱ء کا وہ شمارہ بھی موجود ہے، جس میں علامہ اقبالؒ کا صدارتی خُطبہ (آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد) کا مکمل ترجمہ درج ہے۔ یہ ترجمہ اُن کے فارسی خُطبے سے کیا گیا ہے اور بلحاظِ ترجمہ نہایت معیاری ہے۔

الجمعیّت

الجمعیت کے کچھ شمارے ہیں۔ اب الجمعیت روزنامہ ہو چکا ہے، لیکن ۱۹۲۸ء

میں سہ روزہ تھا' اور اس کی پیشانی پہ جلی خط میں درج ہوا کرتا تھا ——
"جمعیۃ علماء ہند کا واحد ترجمان۔" یہ وہ دَور تھا جب الجمعیت بھی مولانا
محمد علی کے ناقدوں میں شریک ہو چکا تھا۔

پیش نظر اوراق میں یوم جمعہ ۱۴ شوال المکرم ۱۳۴۶ھ مطابق
۱۶ اپریل ۱۹۲۸ء کا الجمعیت ہے۔ اس کے مدیر ابوالاعلیٰ مودودی ہیں۔
صفحہ اوّل پر مولانا محمد علی کا ایک مقالہ ہے' اس کا عنوان ہے "ہندوستان
کی وطنی تحریک کا سنبھالا۔ زعماء ملک کو بروقت تنبیہہ" یہ مقالہ
"ہمدرد" سے ماخوذ ہے۔ اور سُرخی مولانا مودودی کی شوخیٔ طبع کا نتیجہ
ہے' نیز اداریہ اور شذرات بھی مولانا مودودی کے زورِ قلم کا نتیجہ
ہے' اور ان سے مولانا مودودی کے فکر و نظر کے ابتدا کی نقوش
اور جہات کا اندازہ ہوتا ہے۔ "جمہوریت اور ملکیت" کے عنوان سے جو
شذرہ سپردِ قلم کیا ہے اور جس انداز میں مولانا محمد علی جوہر کے خلاف کسی
مرسلہ نگار کے مرسلہ مضمون "کیا یہ کُفر ہے" کا دفاع کیا ہے۔ وہ دلچسپ
بھی ہے اور عبرت آموز بھی۔ گویا یہ شمارہ نہ صرف مولانا محمد علی جوہر بلکہ مودودیات
کے ماخذ میں بھی اہمیت رکھتا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کا جو جُملہ محلِ نظر بنا وہ یہ
تھا کہ" نوعِ انسانی کے لیے مستحسن ادارہ صرف وہ جمہوریت ہے جو خلافتِ
راشدہ کی شکل میں قائم کی گئی۔ اس کو چھوڑ کر بادشاہت کی طرف جانا'
اسلام کو ترک کر کے کُفر کی طرف قدم بڑھانا ہے۔" (مطبوعہ ۱۸ مارچ ۱۹۲۸ء
"ہمدرد")

○ ۲۲ اپریل ۱۹۲۸ء کے صفحات ۴، ۳ ہیں' ان میں صفحہ ۳ پر مولانا
محمد علی کا معرکۃ الآرا مقالہ۔ شریعتِ اسلام میں اصلاح بذریعہ قانون
کیا مسلمان ایک نئی شرع بنانے پر راضی ہیں؟" کے عنوان سے شائع ہوا
ہے۔ یہ بھی "ہمدرد" سے ماخوذ ہے۔

صفحہ ۴ پر "دارالعلوم دیوبند" میں اصلاح کی ضرورت پر ایک طویل رپورٹ ہے، اور یہ رپورٹ دیوبند کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے

○ ۲۴ دسمبر ۱۹۲۸ء کے صفحات ۶، ۵، ۴، ۳ ہیں، صفحہ ۳ پر مطول اداریہ "نہرو رپورٹ پر جمعیۃ علماء کی تنقید" کے عنوان سے شائع ہوا ہے اور صفحہ ۵ تک پھیلا ہوا ہے، شاید اس سے طویل اداریہ آج تک نہیں لکھا گیا ہو۔ اس اداریے پر مولانا محمد مفتی کفایت اللہ، مولانا حسین احمد، ابوالمحاسن محمد سجاد، مولانا حسرت موہانی، مولانا احمد سعید کے دستخط ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اداریہ کی جگہ اُس تنقیدی رپورٹ کو شائع کیا جو ان حضرات کے دستخط سے جاری ہوئے۔ ایک اہم خبر ۴-۵ کے پوسٹ میں ہے:

علامہ اقبالؒ اور مہاراجہ میسور

"مہاراجہ صاحب میسور کو جب معلوم ہوا کہ علامہ اقبالؒ مدراس میں لیکچر دینے کے لئے تشریف لا رہے ہیں، اور میسور و بنگلور میں بھی قیام فرمائیں گے تو اپنے پرائیوٹ سکریٹری کی وساطت سے علامہ ممدوح کو دعوت دی کہ جب آپ میسور تشریف لائیں تو میرے ہاں قیام فرمائیں"

○ ۵ فروری ۱۹۳۰ء: مولانا ابوالاعلیٰ مودودی معلوم ہوتا ہے کہ چند ماہ سے زیادہ الجمعیت کی ادارت سے وابستہ نہ رہے۔ اس کی وجہ بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ بہر کیف اس تاریخ کے الجمعیت پر بحیثیت ایڈیٹر ہلال احمد زبیری بی۔ اے کا نام چھپا ہے۔ مولانا مودودی نے اپنے ایک مقالے میں مولانا محمد علی جوہر سے اپنے گہرے تعلقات و ربط و ضبط کا ذکر کیا ہے۔ جس کی بدیہی شہادت نہیں ملتی۔ زیرِ نظر

شمارے کے صفحہ اوّل پر ایک نہایت عالمانہ مقالہ مولانا محمد ایوّب اعظمی صاحب صدر مدرّس مدرسۂ اسلامیہ دیوریا کا بعنوان "قرآنِ عزیز سے نکاحِ صغائر کا جواز" شائع ہوا ہے۔ یہ مقالہ مولانا محمد علی جوہر کے نقطۂ نظر کی وضاحت و تصدیق کرتا ہے۔ جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔

۵ ۵؍جنوری ۱۹۳۱ء: یہ شمارہ الجمعیت کی ساتویں سالگرہ پر شائع ہوا۔ اور اس کا مقالۂ افتتاحیہ "زندگی کا ساتواں سال" شعبۂ صحافت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایک پیرا ملاحظہ فرمائیے:

"سنہ ۱۹۱۹ء سے لے کر سنہ ۱۹۳۰ء تک الجمعیۃ کی بارہ جلدیں موجود ہیں۔ ان میں سے ہر جلد کو اٹھا کر دیکھا جائے تو بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ ملک کے اندر سیاسی و مذہبی حیثیت سے کوئی ایسا اہم واقعہ نہیں گزرا جس پر الجمعیت نے اظہارِ رائے نہ کیا ہو۔ اور اس اظہارِ رائے میں ہر قسم کے خیالات بالاتر ہو کر اسلام کی مقدس تعلیمات کو اپنے لئے مشعلِ راہ نہ بنایا ہو۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ بے لوث تنقید اور بے لاگ نکتہ چینی بعض افراد کو ناگوار بھی گزری ہے اور انہوں نے الجمعیۃ کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دینے کی دھمکیاں بھی دی ہیں۔ مگر ہم نے کبھی ان دھمکیوں پر توجہ نہ کی اور ہمیشہ یہی سمجھا ہے اعلائے کلمۃ الحق کے جرم میں جس قدر مصیبتیں بھی ہمیں پیش آئیں اُن کے واسطے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔ اور حق و صداقت کے مقابلے میں افراد یا جماعتوں کو قطعاً کوئی پرواہ نہیں کرنی چاہئے۔ ہمارا یہی خیال ہے کہ جس نے ہم کو ہمیشہ ثابت قدم رکھا ہے اور ہم نے کبھی یہ کوشش نہیں کی ہے کہ ہم چند دن کی عارضی مقبولیت حاصل کر لینے کے لئے اپنے اصول کو چھوڑ دیں۔ اور جس مقصد کو

لے کر کھڑے ہوئے ہیں، اس کو کسی دھمکی سے متاثر ہو کر پسِ پُشت ڈال دیں۔"

الجمعیت ۱۳ر جنوری ۱۹۳۱ء (مدیر: ہلال احمد زبیری بی۔اے) صفحہ اوّل پر سیاہ حاشیے میں ایک نظم "آہ محمدؐ علی از ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی اور سیاہ حاشیے ہی میں سہ سُرخی "مولانا محمد علی کا تمام دُنیا میں ماتم" "ہر طبقہ اور ہر خیال کے معاصرین و زعماء کا اظہارِ افسوس" "عالمِ اسلام کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان" کے تحت ملّت، انقلاب، ہمت، اودھ اخبار، زمیندار، ہمدم، پیغامِ صلح کے اداریے کے اقتباسات دیئے ہیں۔ صفحہ ۳ پر دہلی، بمبئی، کلکتہ، کراچی، لندن، پشاور، مُراد آباد، رنگون، بنگلور، مدارس، لکھنؤ، علی گڑھ، پُونا، بلگام، میرٹھ، امرتسر، اٹاوہ، لائل پور، لدھیانہ، راولپنڈی، مُغل سرائے، دربھنگہ، بہرائچ، میں تعزیتی جلسے، جلوس اور عام ہڑتالوں کی رپورٹ پیش کی ہے۔ اور یہ معذرت پیش کی گئی ہے کہ "مولانا محمد علی صاحب کی وفات حسرت آیات پر تعزیت کے جلسوں کی اس قدر، بے شمار اطلاعات ہمیں موصول ہوئی ہیں کہ اس اخبار میں ان کا درج کرنا قطعاً غیر ممکن ہے۔ ہم انشاءاللہ آئندہ ان اطلاعات کا خلاصہ شائع کرنے کی کوشش کریں گے۔"

صفحہ ۴ پر سیاہ حاشیے میں "مولانا محمد علی مرحوم" کے عنوان سے مولانا کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، اور واضح الفاظ میں اقرار کیا ہے کہ:

> "اگرچہ یہ صحیح ہے کہ مولانا محمد علی کی زندگی کے آخری دور میں ہمیں اُن سے اختلاف تھا، لیکن اسے مولانا کی ذات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج وہ رائے کا اختلاف ہمیں اس سے نہیں روکتا کہ ہم مولانا کی عظیم الشان شخصیت اور ان کے بلند مرتبہ کا اعتراف کریں اور اس ناقابلِ بیان کیفیت کو الفاظ کا پیرایہ دینے کی کوشش کریں جو ہمارا قلب مولانا کی وفاتِ حسرت آیات پر محسوس کر رہا ہے۔"

اسی شمارے کی ایک خبر "گجرات جیل میں مولانا محمد علی کی روح کو ایصالِ ثواب، علماء و زعماء ہند کی طرف سے پیغامِ تہنیت" نہایت اہم ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

"۵ر جنوری ۱۹۳۱ء کو تین بجے شام مولانا محمد علی مرحوم کی وفات کی خبر گجرات جیل میں سُنی گئی۔ مسلمان اسیروں کو اس خبر سے سخت صدمہ پہنچا۔ اُسی وقت تعزیت کا ایک تار ڈاکٹر انصاری صاحب نے اور ایک تعزیت کا تار مولانا ظفر علی خاں صاحب، حضرت قبلہ مفتی محمد کفایت اللہ و حضرت مولانا احمد سعید صاحبان، مولانا حبیب الرحمٰن، ڈاکٹر محمد عالم، مسٹر آصف علی، مسٹر فرید الحق انصاری، خان محمد عبد الغفار خاں پشاوری، شیخ حسام الدین، خواجہ عبد الرحمٰن غازی، خان علی گل خاں، اور آغا سید لال بادشاہ سرحدی کی طرف سے بیگم صاحبہ مولانا محمد علی کو لندن بھیجے گئے۔ اور ۶ر جنوری کی صبح کو سب مسلمان اسیروں نے جمع ہو کر قرآن شریف ختم کیا اور ایصالِ ثواب کر کے دُعائے مغفرت کی۔"

یہ تمام لوگ جو بعد میں مطلعِ سیاست پر آفتاب نور فشاں بن کر اُبھرے اس وقت ترکِ موالات کے جُرم میں مقید تھے۔ مولانا محمد علی جوہر ـــــ گاندھی جی کے اس ہتھکنڈے کو مسلمانانِ ہند کے لئے تباہ کُن سمجھتے ہوئے ترکِ موالات ثانی کے خلاف تھے۔ بہ ایں ہمہ مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت اور جد و جہدِ آزادی کے کارنامے کا تقاضا تھا کہ اُن کی وفات پر خونِ حسرت آنکھوں سے ٹپک پڑے۔ آج تاریخ نے ثابت کر دیا کہ دس کروڑ مسلمانانِ برِصغیر کے سیاسی مستقبل کا فطری و حقیقی فیصلہ وہی تھا جس کی جانب مولانا محمد علی جوہر پیش قدمی کی دعوت دے رہے تھے۔

اِنقلاب

○ ۲۵ جنوری ۱۹۳۲ء کا شمارہ پیشِ نظر ہے، یہ مولانا محمد علی جوہر نمبر ہے، لیکن صفحات ۱۲، ۱۱، ۱۰ اور ۲۰ ۱۹ غائب ہیں۔ بلحاظِ ضخامت یہ نمبر سبھوں پر بازی لے گیا ہے۔

"انقلاب" اُس وقت جاری ہوا جب مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر کی ظفر علی خاں سے اَن بَن ہوئی اور ان دونوں نے زمیندار کی ادارت سے مستعفی ہوکر اپنا روزنامہ "انقلاب" جاری کیا۔ "انقلاب" اصلاً "یونینسٹ پارٹی" کا طرفدار اخبار تھا۔ "جوہر نمبر" کے مضامین و مندرجات میں اخبار کی پارٹی پالیسی کا رنگ جھلکتا ہے۔ آیئے اب اس کا جائزہ لیا جائے۔

صفحہ ۳ پر حضرتِ جنید ثانی سابق متعلّم جامعہ نے مولانا جوہر کی تحریروں اور تقریروں کے اقتباسات کو اس طرح مُرتّب کیا ہے، جس سے مولانا جوہر کے سیاسی مَسلک پر روشنی پڑتی ہے

صفحہ ۴ پر سید نیر ایم۔ اے ہزاروی کا مقالہ ہے۔ اور مولانا محمد علی کی سیاسی، مذہبی فکری زندگی اور شخصیت پر بھرپور انداز میں روشنی ڈالنے کی کوشش پائی جاتی ہے۔

صفحہ ۵ پر محمد شریف گینی بی۔ اے، لاہور کا مضمون بعنوان "سر سید اور جمال الدین افغانی کا مجموعہ، رئیس الاحرار کے اوصاف کی جامعیت" اور مولانا راغب احسن متعلّم ایم۔ اے کلکتہ کا مضمون بعنوان "حضرت رئیس الاحرار کی مجاہدانہ زندگی۔ نصب العین اِسلامی کا دُنیا میں زندۂ جاوید مظہر" شائع ہوا ہے۔

صفحہ ۶ پر حضرت راز رامپوری کی مطول نظم بعنوان "فسانۂ غم" ہے۔ مولانا حالی نے اس زمین میں غالب کی وفات پر ترجیع بند فرمایا تھا، راز رامپوری

اُسی مخمّسے سے مولانا محمّد علی جوہر پر ترجیع بند کہا اور سینہ کوبی کی ہے۔
یہاں یہ دلچسپ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ محمّد علی جناح کی وفات پر مُجتبیٰ حسین نے بھی حالی کی پیروی میں ترجیع بند کہا جو ماہِ نَو میں شائع ہوا تھا۔ اِن تینوں میں ربطِ خصوصی ہے اور حالی کی روایت عہدِ حاضر تک یوں مُستقل ہوئی ہے

صفحہ ۷ پر صفحہ ۳ کا بقیہ اور اشتہارات ہیں۔

صفحہ ۸ پر ایک نظم بعنوان "اسلام کا مُجاہدِ اعظم" از محمّد اسد خاں صاحب اسد بی۔اے۔ (ملتان) ہے۔ اور ایک مقالہ "رئیس الاحرار کے عمل کو زندہ رکھو"۔ از سیّد زبیر ہزاروی اور ایک مختصر تحریر "رئیس الاحرار کے سوانحِ حیات اور افکارِ زندگی" از راغب حسن صاحب درج ہے۔

صفحہ ۹ پر رئیس الاحرار کی خود نوشت (۱۰ ذی الحجہ ۱۲۹۵ھ او۔ ۱۵ ذی الحجہ ۱۳۴۵ھ) ہے جو اُنہوں نے "ہمدرد" مورخہ ۱۷ جون ۱۹۲۷ء بعمر پچاس سال لکھی تھی۔

صفحہ ۱۰ پر ٹائمز آف انڈیا کا لندن نامہ نگار کا اقتباس ہے جو "ٹائمز آف انڈیا" کے ۲۲ جنوری کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

صفحہ ۱۱ پر خبریں ہیں، ایک اہم ترین خبر یہ ہے:

گول میز کانفرنس کی ٹاکی فلم

"لندن ۲۲ جنوری: گول میز کانفرنس کے خاتمہ پر وزیرِ اعظم نے جو اعلان کیا تھا۔ برٹش فلم کمپنی نے "ٹاکی فلم" (بولنے والا فلم) لے لیا تھا۔
کل لندن تھیٹر میں اس کی نمائش کی گئی۔ مسٹر میکڈانلڈ، مسٹر ویجوڈ بین، لارڈ پیل، لارڈ پارمور، ارل رسل، سر سموئیل ہور، اور متعدد ہندوستانی مندوبین نے تماشا دیکھا۔ یہ فلم امپیریل ایرویز کے ذریعہ سے آئندہ شنبہ کو ہندوستان بھیج دی جائے گی۔"

یہ خبر پڑھ کر کس کے دل میں اسے دیکھنے کی تمنا نہ ہوگی، اس میں مولانا محمد علی جوہر کرسی پر بیٹھے ہوئے وہ عظیم الشان پیغمرانہ خطبہ دیتے نظر آئیں گے جس میں انہوں نے مکمل آزادی طلب کیا تھا۔ مسلمانانِ ہند کو اقلیت کے بجائے ایک عظیم الشان قوم قرار دیا تھا اور بغیر آزادی لئے واپس جانے پر آزاد ملک میں موت کو ترجیح دی تھی۔

ص ۱۵ ، ۱۴ ، ۱۳ ، ۱۲ پر "شیرِ اسلام کی آخری گرج" کے عنوان سے پہلی گول میز کانفرنس کی تقریر کا مکمل ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔

نجات

"نجات" (ہفتہ میں دو بار) بجنور کا ایک ورق ہے۔ یہ ورق ۱۵ ر جنوری ۱۹۳۱ء کا ہے، اور ایک طویل اداریہ بعنوان "فقید الملت" ہے، جس میں مولانا محمد علی جوہر کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ ایک پیرا ملاحظہ فرمائیے۔ جوشِ خطابت کی گل کاری قابلِ دید ہے:

"آج اگر ڈھونڈھو تو تم کو ہندوستان کے مسلمانوں میں ہزار ول "کنتب" اور "آکسن" اور لاکھوں علیگ مل جائیں گے، ایسے اشخاص بھی مل جائیں گے جن کے زبان و قلم میں خطابت و انشا پردازی کا پورا زور موجود ہے۔ لیکن آہ! محمد علی اس دنیا میں صرف ایک تھا۔ وہ قدرتِ الہیہ کا ایک حیرت انگیز معجزہ تھا، وہ فرعون کے گھر میں پلا لیکن موسیٰ کی دعوت لے کر اٹھا۔ اس کی دوسری مثال کہاں ہے؟"

روزانہ "ملت" دہلی

اس کے مدیر محمد جعفری تھے۔ پیشِ نظر شمارہ ۸ ر جنوری ۱۹۳۰ء کا ہے، اب تک جن اخبارات کا تعارف کرایا ہے وہ $\frac{20\times30}{2}$ پر شائع ہوتے تھے، اس کا سائز

اُس کا نصف یعنی $\frac{20\times30}{2}$ ہے۔

ص ا پر مولانا کی ایک غزل اور تعزیتی قرار دادیں ہیں، ص ۲ پر اداریہ ہے، جس میں مولانا کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ آخری پیرا ملاحظہ فرمائیے:

"مولانا محمد علی کی سوانح عمری موجودہ عہد کی تاریخ کا ایک شاندار باب ہوگا، اور آنے والی نسلیں اس سے آزادی اور حق پرستی کا سبق لیں گی۔ اُن کی زندگی کے مختلف النوع پہلوؤں کی تشریح کوئی آسان کام نہیں ہے، اور نہ "ملت" کی قلیل گنجائش اس کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔ بہر حال محمد علی ہم سے چھین لیا گیا اور اس کے مولا نے اُسے اپنے پاس بُلا لیا، ہمارے لئے صرف اپنی پاک زندگی کا نمونہ چھوڑ گیا۔ ہمیں اب اس کے مقصد کی تکمیل کی طرف لگ جانا چاہئے، کیونکہ یہی اس کی سب سے بڑی یادگار ہوگی۔ اور یہی اس کے ساتھ عقیدت مندی کا ثبوت۔"

اسی صفحہ پر مولانا عبدالماجد دریا بادی کے اُس مقدمے کا اقتباس ہے، جو اُنہوں نے کلامِ جوہر پر تحریر فرمایا تھا۔ ص ۳ پر "کراچی کے ایک اسکول کا تعصب" کے عنوان سے ایک خبر شائع ہوئی ہے، ملاحظہ فرمائیے:

"کراچی ۷ر جنوری: کراچی ماڈل اسکول کے کارکنوں نے اسکول کو بند کرنے سے انکار کر دیا تھا، چنانچہ کہا جاتا کہ مسلمانوں کے ایک بہت بڑے مجمع نے آج صبح کو اسکول مذکور پر حملہ کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجمع منتشر ہو گیا۔"

ایک اور خبر کی سُرخی یہ ہے "سابرمتی جیل سے تعزیتی تار، مسز گاندھی کا اظہارِ غم" پوری خبر یہ ہے:

"احمد آباد ۶ر جنوری: گاندھی جی کی اہلیہ نے مولانا محمد علی کی بیگم محترمہ کو ذیل کا بحری تار لندن ارسال کیا ہے:

" مجھے مولانا کی وفات سے سخت صدمہ ہوا۔ میں اپنی گہری ہمدردی کا اظہار کرتی ہوں۔"

مسٹر مہادیو ڈیسائی، مسٹر منی لال گاندھی اور مسٹر دیو داس گاندھی (مجبوس سابرمتی جیل) اور امام صاحب باوازیر نے بھی مولانا شوکت علی کے پاس بحری تار دیا ہے —

"ہم سب بھی آپ کے رنج وغم میں شریک ہیں۔"

(ا۔ ب)

○ ملت ۔ دہلی مورخہ ، جنوری ۱۹۳۱ء صفحہ اوّل پر سیاہ چوکٹے میں مولانا محمد علی کی وفات کی خبر شائع کی ہے مختصر "اداریہ" میں اس اندوہناک قومی حادثہ پر غم کا اظہار ہے"

ص ۳ پر مولانا محمد علی کی وفات کے بارے میں خبریں اور تعزیتی پیغامات ہیں۔

○ ملت ۔ دہلی مورخہ ۹ جنوری ۱۹۳۱ء صفحہ ۲ پر اداریہ بعنوان "قائدِ اعظم کا ماتم" ہے ۔ اسی صفحہ پر مولانا کا وہ خط بھی شائع ہوا ہے جو مولانا نے اپنے برادرِ نسبتی معظم علی بار ایٹ لا جج ریاست اندور کو لکھا تھا ۔ اس میں انہوں نے اپنی علالت، طریقۂ علاج وغیرہ پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے ۔

"سیاست"

○ اس روزنامہ کا ۱۵ جنوری ۱۹۳۱ء (جلد ۱۲ نمبر ۷) کا شمارہ پیش نظر ہے ۔ اس کے ایڈیٹر پرنٹر پبلشر سید عنایت اللہ شاہ تھے اور کوآپریٹو پرنٹنگ پریس لاہور میں طباعت ہوا کرتی تھی ۔ سائز $\frac{20 \times 30}{2}$ ہے ۔ اس کی پیشانی پر علامہ اقبال کا یہ شعر نظر آتا ہے :

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

صفحہ اوّل پر خبریں ہیں۔ سب سے سُرخی یہ ہے "ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کے بغیر لوگ اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کر سکتے" ذیلی سُرخی "مسٹر جناح کی تصریحات" ہے ملاحظہ فرمائیے:

لندن ۷ جنوری:

"مسٹر جناح نے ارشاد فرمایا" لارڈ ریڈنگ آج جس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ ہندوستانی بہت مدّت پہلے اس حقیقت کو الم نشرح کر چکے ہیں کہ کوئی حکومت کو ذمہ دارانہ حیثیت مرحمت نہ کرنا ممکن نہیں۔ برطانیہ کے لئے اس امر کو واضح کرنا از بس لازمی ہے کہ وہ کتنی اور کیسی ذمہ داری ہندوستان کو عطا کرنے کو تیار ہے، ہندوستان میں ایک مضبوط جماعت کامل آزادی کی زبردست حامی ہے۔ دوسرا گروہ نو آبادیاتی حکومت کا طالب ہے، برطانیہ کو چاہئے کہ ان دونوں گروہوں کے اکثر حصّہ کی رضاجوئی کی غرض سے کسی موثر اقدامِ عمل سے کام لے، اگر برطانیہ نے کوئی قابلِ قدر عملی سعی کی، تو ہم اسے اپنی تائید کا یقین دلاتے ہیں۔ ہاں یہ بھی صحیح ہے کہ اقلیتوں کے حقوق و مفاد کے تحفّظاتِ آئینی کے بغیر ذمہ دارانہ حکومت عطا نہیں کی جا سکتی۔ میں نو آبادیاتی حکومت یا کامل ذمہ دارانہ حکومت کے متعلق کسی خیال کا دلدادہ نہیں ہوں لیکن اس پر یقین رکھتا ہوں کہ ذمہ دارانہ حکومت کی تجاویز و تدابیر ایسی ہونی چاہئے، جسے ہندوستان کے اکثر اربابِ سیاست بہ نظرِ استحسان دیکھتے ہیں۔"

مولانا محمد علی جوہر کے فکر و نظر اور مسٹر محمد علی جناح کی سوچ کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ اس تصریحات سے قبل مولانا جوہر نے واضح الفاظ میں کہہ ڈالا تھا کہ برِّ صغیر کے دس کروڑ مسلمان دوسری اقلیتوں کے زمرے میں نہیں آتے، یہ ایک قوم ہیں" وزیرِ اعظم برطانیہ کے نام ان کا خط اس بات کا بدیہی ثبوت ہے کہ وہ "نظریۂ دو قومی" کے حقیقی مُصنّف ہیں ـــــ!

صفحہ ۲ پر خبریں اور "آہ! مولانا محمد علی" کے عنوان سے ایک نظم شیخ نذر محمد انور مسلم ہائی اسکول لائل پور کی شائع ہوئی ہے۔

○ ۷ رجنوری ۱۹۳۱ء کے شمارے کی ہیڈ سُرخی ہے: مولانا محمد علی کا اِنتقالِ پُرملال، شرکائے گول میز کانفرنس کا اظہارِ رنج۔ "مجلسِ عاملہ پنجاب خلافت کا جلسۂ تعزیت" صفحہ اوّل اور دوم پر مشاہیر کے تعزیتی پیغامات اور لاہور کی ہڑتال کی رُوداد ہے، خود سیّد عنایت اللہ مدیرِ سیاست لاہور نے سوگِ جوہر میں ایک دن کی تعطیل کا اعلان یوں کیا "سیاست کے ادارۂ اہتمام کو افسوس ہے کہ وہ شبِ برات کی تعطیل کے بعد اس قدر جلد دوسری تعطیل کا اعلان کر رہا ہے۔ لیکن ہمیں اُمید ہے کہ ناظرینِ کرام ہم سے اتفاق کریں گے کہ جس تعطیل کا ہم آج اعلان کر رہے ہیں، یہ ناگزیر ہے۔ الحاج حضرت مولانا محمد علی صاحب مرحوم و مغفور اخبار نویس بھی تھے اور اُنہوں نے سرکاری مُلازمت ترک کر کے محض بدیں وجہ صحیفہ نگاری اختیار کی تھی۔ کہ مُلک میں آزادی کی رُوح پیدا کر دیں۔ دُنیا جانتی ہے کہ یہ اس مقصد میں کامیاب ہوتے، اور اُن کے اخبار "کامریڈ" (انگریزی) اور "ہمدرد" (اُردو روزنامہ) نے غلامانِ ہند کو گرما دیا۔ آج آزاد نگارانِ ہند کے اس اُستادِ خُلد آشیاں کے اِس احسان کا بدلہ ہم یہی دے سکتے ہیں کہ اس کی یاد میں ایک روز کام بند رکھیں۔ اور اپنا دن مرحوم کے لئے دُعائیں صرف کریں۔ چنانچہ آپ کی خبرِ انتقال موصول ہوتے ہی مسٹر مجید ملک کی تحریک پر مسلمان صحیفہ نگارانِ لاہور نے فیصلہ کیا ہے کہ کل اخبار بند رہیں۔ لہٰذا دفتر سیاست بھی بند رہے گا۔"

صفحہ ۳ پر "آہ! مولانا محمد علی" کے عنوان سے اداریہ از قلم حبیب ہے۔

ایک پیرا ملاحظہ فرمائیے:

"شہداء مرا نہیں کرتے، اور مولانا جیسے عاشقِ جانباز۔ فنا نہیں ہوتے اس لئے کہ:

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

صفحہ ۴ پر "مولانا محمد علی جوہر" از مسلم ایک نظم ہے، مطلع ملاحظہ فرمائیے:

افتخارِ ہندیاں جاتا رہا
نازشِ اسلامیہ جاتا رہا

صفحہ ۵ پر مولانا محمد علی جوہر کی ایک قلمی تصویر (اسکیچ) ہے اور خوب ہے۔ باقی صفحات پر مختلف مُلکی و غیر مُلکی خبریں ہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اخبار کا ہر صفحہ سیاہ حاشیے کے ساتھ چھپا ہے۔

ریاست

۱۵ جنوری ۱۹۳۱ء کے شمارے کا ایک ورق محفوظ ہے، یہ ۲۵ اور ۲۶ صفحہ ہے، جو اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ ریاست، دہلی کا ضخیم نمبر شائع ہوا تھا، ریاست کا سائز $\frac{20\times30}{8}$ ہے۔

صفحہ ۲۵ پر کارٹون کے ذریعہ مولانا محمد علی مرحوم کی پبلک زندگی از ۱۹۰۶ء تا وفات دکھائی گئی ہے۔ بارہ کارٹون ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں قبل کے صفحات پر ان کی زندگی کے اس سے قبل کی جھلکیاں دکھائی گئی ہوں گی۔

صفحہ ۲۶ پر ناظم زادہ نے "صبح کا ستارہ" کے عنوان سے ایک خوبصورت نظم پیش کی ہے اور نہایت شاعرانہ انداز میں مولانا محمد علی کو ستارۂ صبح سے مشابہ قرار دیا ہے۔

نئی دُنیا

۱۲ جنوری ۱۹۳۱ء کا شمارہ ہے، کلکتہ سے شائع ہونے والے اس ہفتہ وار کے مدیر صدیق انصاری ہیں، سائز $\frac{20\times30}{4}$ پر شائع ہوا کرتا تھا۔ صفحہ اول پر "محمد علی زندہ باد" کا عنوان دے کر آیتِ حکیم پیش کی گئی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ شہید نہیں مرتے۔

صفحہ ۲ پر مدہوش کی نہایت خوبصورت نظم "محمد علی" ہے ؎
"تجھے ہر سُو نگاہیں ڈھونڈتی ہیں"

صفحہ ۳ پر اداریہ میں مولانا محمد علی کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے اور مولانا محمد علی کی کلکتہ میں یادگار قائم کرنے کی فہمائش کی گئی ہے، نیز پارس لاہور (ہفتہ وار) کے اداریے کا اقتباس بھی دیا گیا ہے۔

صفحہ ۴ پر محمد عبدالصمد قمر صدیقی بی۔ اے کی ایک نظم "محمد علی" ہے جس میں مولانا کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔

صفحہ ۵ پر مولانا محمد علی کی وفات پر تاثراتی مضامین درج ہیں، صفحہ ۶ پر مولانا محمد علی کے مضامین و تقاریر کے اقتباسات درج ہیں۔

صفحہ ۷ پر خبریں، اور کلکتہ خلافت کمیٹی کا تعزیتی اجلاس اور اہم قراردادیں ہیں۔ ان قراردادوں میں سے "کلکتہ میں مولانا محمد علی میموریل ہال بنانے" اور "لوئر چیت پور روڈ کا نام محمد علی روڈ رکھنے" کی قراردادیں بھی شامل تھیں۔

ایک خبر سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانانِ کلکتہ کا عظیم الشان اجتماع ۱۱ر جنوری کو مونومنٹ میدان میں ۲ بجے شروع ہوا۔

ہفتہ وار مصور پیام' کلکتہ

۱۱ر جنوری ۱۹۳۱ء کا شمارہ پیش نظر ہے۔ یہ 'محمد علی' نمبر ہے۔ $\frac{20\times30}{4}$ سائز کے ۲۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ ص اول پر مولانا محمد علی کی ایک تصویر ہے اور صفحہ ۲ پر میدانِ کلکتہ میں مسلمان نمازِ جنازہ کے لئے صف بستہ نظر آرہے ہیں۔ صفحہ ۳ پر اداریہ ہے، ایک پیرا ملاحظہ فرمائیے :-

"ہمارے آنسو اور ہماری آہیں اپنے محسن کے لئے ہوں گی، لیکن محمد علی کے آنسو اور آہیں ایک غافل اور ناشکر گزار قوم کے لئے تھیں، ہم اس لئے روتے ہیں کہ فیض کا دروازہ ہم پر بند ہوگیا۔ اور وہ اس لئے روتا تھا کہ ہماری

بلا طلب ہم پر اپنے فیض کا دروازہ کھول دے ۔ ہم اپنی محرومی پر ماتم کر رہے ہیں، اور وہ اپنی عطاء کی تعمیم کے لئے ماتم کرتا تھا۔"

ص ۶ اور ص ۷ پر صوفی شاہ محمد خاں اور حضرت نشتر کے منظوم تاثرات ہیں۔ صفحہ ۸ اور ۹ پر کلام جوہر ہے، خواجہ حسن نظامی کا لکھا ہوا قلمی چہرہ ہے ۔

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - "مولانا عبدالماجد دریابادی کی نعت جو مولانا مرحوم کے خاص معتقد ہیں" درج ہے ۔

عبدالماجد دریاباوی نے مولانا جوہر کی زمین میں نعت کہی ۔ سماعت فرمائیے ۔ کہ بحیثیت شاعر انہیں کون جانتا ہے!

پڑھو صلِ علیٰ حق کے محبوب کی ہوں باتیں
رحمت کی گھٹائیں ہوں اور نور کی برساتیں
وعدے ہیں شفاعت کے تسکین کی ہیں باتیں
آقائے دو عالم کی دیکھو تو مدارا تیں
غم خواریِ اُمت سے اک آن نہیں غافل
ظاہر میں تو ہے پردہ، پردہ میں مُلاقاتیں
محشر میں اماں پائی، صدقے میں درودوں کے
دُشواری میں کام آئیں بھیجی ہوئی سوغاتیں
دارین کے کیا جلوے، فردوس کے کیا نقشے
سب کا وہی دولہا ہے، سب اس کی ہیں باراتیں
اِک نام مبارک ہے اور وِرد درودوں کا
سارا یہی تحفہ ہے، کُل ہیں یہی سوغاتیں
دیدار کی حسرت ہے اور نام کی رٹ ہر دم
اس شغل میں دن گزرے اس دُھن میں کٹیں راتیں
ہم نام پیمبر میں ہے اتنا اثر اب بھی
یونان کو دی ذلت، شیطان کو دیں ماتیں

صفحہ ۱۰ پر "ہمدرد" ۱۷ مارچ ۱۹۲۷ء کا اداریہ شائع کیا ہے، اس اداریے میں مولانا نے ۱۹۲۱ء کی قومی تحریک کی تباہی کے اسباب پر مدلل بحث فرمائی ہے۔

صفحہ ۱۲ پر مولانا جوہر کی وہ کیفیتِ خاص میں ڈوبی ہوئی غزل ہے جو انہوں نے مدینہ منورہ جاتے ہوئے آخری منزل میں ارتجالاً فرمایا تھا۔ مطلع ہے:

سب سمجھتے ہیں کہ تو شاد ہے، مسرور ہے آج
کون کہتا ہے، دلا، تو دلِ رنجور ہے آج

صفحہ ۱۳ پر بی اماں آبادی بیگم کی وہ تقریر ہے جو انہوں نے کولمبو کانگرس ہال میں ۱۵ جنوری ۱۹۲۴ء کو خواتین کے جلسے میں لنکا میں کی تھی۔

صفحہ ۲۰، ۱۹ پر "قفلِ بے کلید" کے عنوان سے مولانا محمد علی کا ایک فکاہیہ پیش کیا گیا ہے جو "ہمدرد" ۱۳ جنوری ۱۹۲۶ء سے ماخوذ ہے، دوسرا فکاہیہ "نہیں کی نہیں ہی" کے عنوان بھی ہمدرد ۲۸ جنوری ۱۹۲۶ء سے ماخوذ ہے۔

یہ دونوں فکاہی مضامین مولانا محمد علی کے شعورِ طنز و مزاحِ لطیف کی غمازی کرتے ہیں۔

صفحہ ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱ پر مولانا محمد علی کی آخری تقریر جو پہلی گول میز کانفرنس منعقدہ لندن کے چوتھے پلینری اجلاس میں فرمائی تھی، درج ہے۔

صفحہ ۲۵، ۲۷ پر مولانا محمد اکرم خاں صاحب کا مختصر مضمون ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں:

"محمد علی علومِ مغرب کا ماہر تھا، لاثانی ادیب تھا، زندہ دل شاعر تھا، زبردست مقرر تھا، حق و صداقت کے میدانِ جہاد کا ایک جانباز سپاہی تھا، ایک بہادر سپہ سالار تھا، اپنے پیارے وطن کا جانثار خادم تھا اور اپنے پاک مذہب کا سرفروش فدائی تھا۔ اس کی زندگی نسیم صبح کی اٹھکھیلیوں کا مجموعہ نہ تھی، بلکہ وہ آندھی کی طرح آیا، اور بگولے کی طرح عالم بالا کو پرواز کر گیا، وہ بجلی کی طرح چمکا، بادل کی طرح گرجا اور بارانِ رحمت کی طرح برسا، ایسا برسا کہ خدا کی پیاسی زمین

شاداب ہوگئی۔ محمد علی خود ایک تضاد تھا، ایک تلاطم تھا، ایک مجسم انقلاب تھا، محمد علی سے اس خلفشار کو نیا زور تسلسل ملا تھا۔ مسٹر محمد علی سے مولانا محمد علی اور غازی محمد علی سے شہید محمد علی تک مجھے اسے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ لہذا کہہ سکتا ہوں کہ محمد علی کی ذات ایک معمولی شخصیت نہ تھی اور اس کے کارنامے معمولی کارنامے نہ تھے۔ اس کے اصلی کارنامے نہ تو اخبار کے کالموں میں ظاہر ہو سکتے ہیں، اور نہ اس کے مدعیانہ عقیدت میں بہتوں کو اُن کی اطلاع ہے۔ محمد علی کی ساری زندگی اُس عشقِ بے محابا کی عملی تفسیر ہے جو بے دھڑک آتشِ نمرود میں کود پڑا تھا اور اس کی ساری حیات اُس رضا و تسلیم کی روشن تعبیر ہے جس نے زندانِ مصر میں جمالِ یوسفی کو کمال تک پہنچا دیا۔ مرحوم خود کہتے ہیں ؎

فیض سے تیرے ہی اے قیدِ فرنگ
بال و پر نکلے قفس کا در کھلا

صفحہ ۲۸، ۲۷، ۲۶ پر بھی مشاہیر کی آرار اور خود مولانا محمد علی جوہر کے مضامین کے اقتباسات ہیں۔

رتبۂ محمد علی

علامہ اقبالؔ

اے خوشا مشتِ غبارِ او کہ از جذبِ حرم
از کنارِ اندلس از ساحلِ بربر گذشت
خاکِ قدس او را بہ آغوشِ تمنّا در گرفت
سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت

(الامان ۱۹ فروری ۱۹۳۱ء جلد ۱۲ نمبر ۱۳)

رخصت ہوئی چمن سے چمن کی بہار آج

مولانا ظفر علی خاں

جوہر کے انتقال کی جانکاہ تھی خبر
ہر فردِ قوم رنج سے ہے بیقرار آج
ثابت یہ کر رہا ہے لباسِ کبود رنگ
بے مہر آسماں بھی ہوا سوگوار آج
اُترا ہوا ہے چہرۂ مہتاب رنج سے
دستارِ آفتاب بھی ہے تار تار آج
وہ غم ہے یہ کہ گریۂ شبنم کو دیکھ کر
گلشن میں چشمِ گل بھی ہوئی اشکبار آج
دشمن بھی نوحہ خواں ہیں جنازہ کو دیکھ کر
تنہا نہیں الم میں ترے دوستدار آج
کاشانۂ وطن میں بجھی شمع ضوفشاں
رخصت ہوئی چمن سے چمن کی بہار آج

(زمیندار الجمعہ ۱۴ر جنوری ۱۹۳۱ء)

قطعہ تاریخ

سالِ وفات مولانا محمد علی جوہرؔ

آغا شاعر قزلباش

دنیا سیاہ پوش ہوئی یک بیک کیوں — حیرت ہے اہلِ ہند کو یا رب یہ کیا ہوا
لندن میں پائی آہ محمد علی نے موت — جو منہ سے کہہ چکا تھا وہ وعدہ وفا ہوا
بیشک غلام ملک میں زندہ نہ آیا وہ — غربت میں اپنی جان دی آزاد ہو گیا
مارا گیا وطن کے لئے صاحبِ فراش — تھا مرد اپنے قول سے ایک انچ کب ہٹا
روتی ہے آج اس کیلئے مادرِ وطن — ایسا سپوت مادرِ گیتی نے کب جنا
تحریر کا وہ مرد تھا، تقریر میں وہ فرد — لاثانی ایک مسلم جانباز مر مٹا
قربانیاں ہزار ہوں اب ملک و قوم میں — اسلام کا یہ شیر مگر ایک ہی تو تھا
ممکن نہیں کہ اسکی جگہ پُر کوئی کرے — بے مثل لاجواب یہ ہستی ہوئی فنا
شاعرؔ کو ذاتیات سے گو کام کچھ نہیں — جوہرؔ کی موت نے اسے صدمہ دیا بڑا
سالِ وفات کیلئے کی فکر بار بار — مصرعہ بغیر تعمیہ جب لیکن نہ ہو سکا

نکلی جو آہ دل سے تو سالِ وفات ہے
جوہرؔ سا شخص حیف غریب الوطن ہوا

(آہ + غریب الوطن ہوا = ۱۳۴۹ھ)

(نجات، بجنور، ۱۵ر جنوری ۱۹۳۱ء)

قافلہ سالار موتمر اسلامیہ

ضیاء بدایونی القادری

جدا وطن سے وطن کا جو رہنما ہو جائے
وطن پرستوں میں محشر نہ کیوں بپا ہو جائے

ہے آج سانحۂ کبریٰ جہانِ مسلم میں
کہیں قیامتِ صغریٰ نہ اب بپا ہو جائے

وطن سے دور محمد علی شہیدِ وطن
غضب کہ اہلِ وطن کے لئے فنا ہو جائے

ستم کہ قافلہ سالارِ مجلسِ اسلام
ہماری بزم سے یوں یک بیک جدا ہو جائے

وہ اک مجسمۂ شانِ قابلیت تھا
محال ہے کہ کوئی ایسا دوسرا ہو جائے

وہ اپنا قائدِ اعظم وہ رہنمائے جہاں
ہزار حیف کہ نذرِ رہ فنا ہو جائے

نہ جائے یہ غمِ جانکاہ کبھی دل سے
جو کوہِ صبر دلِ صبر آزما ہو جائے

خدا ہی پار لگائے گا تو ناؤ پار لگے
غریقِ بحرِ فنا جب کہ ناخدا ہو جائے

الٰہی نامِ محمد علی کے صدقے میں!
بہشت جو بری قوم کو عطا ہو جائے

دعائے مغفرت والتجائے رحمت کو
بلند کاش ہر اک دستِ فاتحہ ہو جائے

ضیاء ہوئی ابدی زندگی اسے حاصل
وہ ہے شہیدِ رہِ حق میں جو فنا ہو جائے

(الامان ۱۹ فروری ۱۹۳۱ء)

فسانۂ غم

راز رامپوری

کسی پہلو اسے قرار نہیں — ہائے نیرنگِ عالمِ فانی
بے اثر ہیں فتوحِ چنگیزی — بے نتیجہ ہے علمِ یونانی
قبرِ دارا رہی نہ تربتِ کَے — تختِ خاقاں رہا نہ خاقانی
ایک نقطۂ فسانہ کار ہے اب — تابشِ خاتمِ سلیمانی
صرف رنگینیٔ خیال ہے اب — جامِ جمشید و حسنِ کنعانی

درخورِ عیش کائنات نہیں
جو یہاں ہے اسے ثبات نہیں

انقلابِ جہاں ارے توبہ — وصل ہم معنیٔ جدائی ہے
لوٹ لینا ہے رہبری کا شرف — غوطے دینا یہ ناخدائی ہے
مختصر ہے یہ حالِ دنیا کا — کبھی شاہی کبھی گدائی ہے
ہر اشارہ ہے اسکا مرگ انجام — اور جگر سوز دلربائی ہے
پاسِ جوہر بھی اسکو کچھ نہ ہوا — بے وفائی کسی بیوفائی ہے

نشترِ غم سے دل فگار کیا
ہنسنے والوں کو اشکبار کیا

ہند سے رخصتِ بہار ہے آج — ایک گلشن طراز تھا نہ رہا
کون ملت کے ناز اٹھائیگا — جو سراسر نیاز تھا نہ رہا
کس کو اہلِ جنوں کا غم ہوگا — جو محبت نواز تھا نہ رہا

اب حقیقت کو کون سمجھے گا — جس کو علمِ مجاز تھا نہ رہا
بزمِ خدامِ کعبہ مٹتی ہے — جو فدائے حجاز تھا نہ رہا

فخرِ ہندوستاں کی رخصت ہے
جوہرِ نکتہ داں کی رخصت ہے

ہمتِ غم کا امتحاں کر لیں — آج بھی پاسباں سے چھٹتے ہیں
گلشنِ ہند پہ خزاں آئی — پھول سب باغباں سے چھٹتے ہیں
کیوں دلوں کے کنول نہ مرجھائیں — رونقِ بزمِ جاں سے چھٹتے ہیں
محفلِ عیش کیوں نہ ہو برہم — ہم نشاطِ جہاں سے چھٹتے ہیں
اپنے نغمے سنائے گا اب کون — بلبلِ بوستاں سے چھٹتے ہیں

یہ نشانی خزانِ ہند کی ہے
موت اسلامیانِ ہند کی ہے

ناز کس پر کریں گے اب احباب — معنیٔ لفظِ آشنا نہ رہا!
ٹھوکروں سے بچائیگا اب کون — آفتابِ جہاں نما نہ رہا
دادِ مظلوم کس سے پائیں گے — جانِ نثارِ شہ و گدا نہ رہا
داستانِ الم کہیں کس سے — تھا جو دمسازِ غم رہا نہ رہا
ہو گیا سرد شوق کا بازار — غیرتِ برقِ شعلہ زا نہ رہا

حسنِ تحریر آج مٹتا ہے
نازِ تقریر آج مٹتا ہے

تہہ و بالا ہے قوم کی کشتی — پار اس کو لگائیگا اب کون!
مٹ گیا تھا جو قوم کا عاشق — اپنی ہستی مٹائے گا اب کون
نہ رہا تھا جو قوم کا رہبر — ٹھیک رستہ بتائے گا اب کون

سعیِ آزادیِ وطن کے لئے | جیل خانے بسائے گا اب کون
اٹھ رہا ہے نشانِ باطل کا | اس کو اٹھ کر گرائے گا اب کون

تھا جو زینت طرازِ ہند مٹا
ہائے کیا دلنوازِ ہند مٹا

جو ارسطو دماغ تھا نہ رہا | آج مشکل میں کس سے لیں رائیں
کون ہے واقفِ منازلِ ہند | پیشرو اپنا کس کو ٹھہرائیں
کس سے پوچھیں نشاطِ قوم کا راز | کس سے قسمت کا پیچ کھلوائیں
حق و باطل کی بحث چھڑتی ہے | کس کو بہرِ محاکمہ لائیں
مٹ رہی ہے امید گاہِ انام | کچھ بتاؤ کہ ہم کدھر جائیں

نور افشاں دماغ تھا نہ رہا
گوہرِ شب چراغ تھا نہ رہا

قوم کے ناز جو اٹھاتا تھا | اس کی میت اٹھا رہی ہے قوم
حالتِ قوم پہ جو گریاں تھا | اس پہ آنسو بہا رہی ہے قوم
جو اٹھاتا تھا سونے والوں کو | آج اس کو سلا رہی ہے قوم
جس کی تعمیرِ قوم کی دھن تھی | اس کا مدفن بنا رہی ہے قوم
نوحہ خواں تھا جو قوم کا اے راز | اس کا نوحہ سنا رہی ہے قوم

رہبر و متقی کی میت ہے
یہ محمد علی کی میت ہے

(روزنامہ انقلاب ۲۵ جنوری ۱۹۳۱ء)

آفتابِ مشرق کا ماتم

نہال سیوہاروی

اٹھ گیا وہ ذات تھی جس کی سراپا انتخاب
عالمِ اسلام میں جس کا نہ تھا کوئی جواب
تیرہ شو اے آفتاب

پھینک دے فرشِ زمیں پر تاجِ زریں پھینک دے
پوششِ غم میں کہیں پر تاجِ زریں پھینک دے
تیرہ شو اے آفتاب

یوں گہن میں آ، زمیں کیا آسماں تاریک ہو
آج ہے وہ روزِ بد سارا جہاں تاریک ہو!!
تیرہ شو اے آفتاب

نازشِ خاور دکھا کر اپنے جوہر چل دیا!
تھے سلاطیں جس سے لرزاں وہ سکندر چل دیا
تیرہ شو اے آفتاب

اٹھ گیا جوہر امیرِ کارواں کس کو کہیں!
بیشۂ اسلام کا شیرِ نہ باں کس کو کہیں
تیرہ شو اے آفتاب

ملتِ ختمِ رُسل کا کون اب غم کھائے گا
دردِ قومی سے کلیجہ کس کا منہ کو آئے گا

تیرہ شد اے آفتاب

مطلعِ ہندوستاں پر ابرِ ماتم چھا گیا
حشر سے پہلے الٰہی حشر کا دن آ گیا

تیرہ شد اے آفتاب

مصر و ترکی کا ہر اک پیر و جواں خونبار ہے
اک یہاں خونبار ہے تو اک وہاں خونبار ہے

تیرہ شد اے آفتاب

شام کہتا ہے کہ مجھ پر شامِ ظلمت آ گئی
شور ہے ایران میں ہر سو قیامت آ گئی

تیرہ شد اے آفتاب

چرخ کو منظور شاید رنج کی تکمیل ہے
ملکِ افغاں کثرتِ گریہ سے ارضِ نیل ہے

تیرہ شد اے آفتاب

مادرِ گیتی بشر ایسا کہاں سے لائے گی!
مختصر یہ ہے قیامت صد اب آئے گی

تیرہ شد اے آفتاب

روشنی را ہم سیاہی کن کہ آں ساقی نماند
میکدہ ویراں شد و لطفِ مے باقی نماند

تیرہ شد اے آفتاب

(جگر فگار نہال)   (الامان ۱۹ فروری ۱۹۳۱ء)

آہ محمد علی

ڈاکٹر سعید احمد بریلوی

جا ہی پہنچا آج تو بھی آہ! بی اماں کے پاس — بزم آرا جس جگہ ہیں اجمل و بی آرداس
داغ لگنا تھا یہ انگلستان ہی کے نام پر — موت کی بجلی گرائی ضیغمِ اسلام پر
راہِ آزادی میں دیدی جان ہو کر بیقرار — آہ اے شیدائے حریت وطن تجھ پہ نثار
تو گیا تھا ہم کو آزادی دلانے کے لیئے — قوم کو قیدِ غلامی سے چھڑانے کے لیئے
کیا غلاموں کی قیادت سے وہاں شرم آگئی — رُوح جو قیدِ بدن سے اسقدر گھبرا گئی
قوم کو چھوڑا اسی ذلت میں مرنے کیلیئے — اس سیہ بختی پہ اپنی صبر کرنے کے لیئے
کہہ دیا تھا صاف تو نے بر سرِ اجلاسِ عام — میں وطن میں جاؤنگا واپس نہ بننے کو غلام
آشکارا مرکے رازِ بزمِ شوریٰ کر دیا — جو زباں سے کہہ چکا تھا اس کو پورا کر دیا
ایسی نفرت ہو گئی تھی اس غلامستان سے — قبر کو دو گز زمیں مانگی تو انگلستان سے
روٹھنے والے! مگر ہم تجھ کو کیسے چھوڑ دیں — رشتۂ الفت بھلا کر دل سے بالکل توڑ دیں

بچہ بچہ ہے وطن کا آج سرگرمِ فغاں
تیرے غم میں بن گیا بزمِ عزا ہندوستاں

ماتمِ جوہر

حامد الانصاری غازی

اے جوہرِ ہندوستاں — اے ہند کی روحِ رواں
اے زینتِ بزمِ وطن — اے رہنمائے ہندیاں
اے فخرِ دینِ مصطفےٰ — اے قائدِ اسلامیاں

ہندوستاں تیرے لئے
سارا جہاں تیرے لئے
مغموم ہے مغموم ہے

اے جاں نثارِ حریت — اے دوست دارِ حریت
اے کامیابِ زندگی — اے کامگارِ حریت
اے شاہِ تقریر و قلم — اے تاجدارِ حریت

ہندوستاں غمگین ہے
سارا جہاں غمگین ہے
تیرے لئے تیرے لئے

قوم کا دمساز تھا — ہم سب کو تجھ پر ناز تھا
دیتا تھا تو جاں قوم پہ — لاریب تو جانباز تھا
ہندوستاں میں اور تو — قدرت کا اک اعجاز تھا

اے کامگارِ زندگی
اے جاں نثارِ زندگی
زندہ ہے تو زندہ ہے تو

تو آفتابِ مشرق تھا   تو نورِ حق میں غرق تھا
ہستئ باطل کے لئے   میں کیا کہوں اک برق تھا
تیرا وجود اور ہند میں   گویا طلوعِ مشرق تھا

اے کامیابِ زندگی
اے آفتابِ زندگی
کیوں جا چھپا مغرب میں تو

تو کامل الایمان تھا   تو حریت کی جان تھا
آزادئ اقوام کا!   دل میں ترے ارمان تھا
تھا فخر تجھ سے ہند کو   نام آور و ذی شان تھا

تو ہم سے رخصت ہو گیا
تو ہم کو بالکل کھو گیا
حق مغفرت تیری کرے

اُف آج تو ہم میں نہیں   کیسے کریں اس کا یقیں
اب صرف تیری یاد ہے   وقفِ دلِ اندوہگیں!
جاتا ہے کوئی اس طرح   ایسا بھی ہوتا ہے کہیں

گو آج تو آزاد ہے
اور روح تیری شاد ہے
اے ساکنِ خلدِ بریں

(مدینہ ۲۵ر جنوری ۱۹۳۱ء)

محمد علی جوہؔر

سیّد ہاشم رضا

وطن کی رُوح تھے ملّت کی جان تھے جوہؔر
جہاں میں نازشِ ہندوستان تھے جوہر

خوشا نصیب وہی نام ان کے نام میں تھے
کہ جن کے سب سے بڑے قدردان تھے جوہر

تڑپ تڑپ کے محمّد کا نام لیتے تھے
صنم کدوں میں بلالی اذان تھے جوہؔر

تھی ان کے چشمِ تصوّر میں ذوالفقارِ علی
جہاں عدو تھے وہاں پاسبان تھے جوہر

حسینیت کے عَلم کو بہت بلند کیا
رہِ رضا میں ظفر کا نشان تھے جوہر

خموش خستہ تنوں کی زبان تھے جوہؔر
وفا و مہر و محبت کی جان تھے جوہر

بلندِ فکر تھی جیسی، عمل بھی تھا ویسا
سلف کی بھولی ہوئی داستان تھے جوہر

حکومت اور شہنشاہیت نشانہ بنی
جہاں سے تیر چلے وہ کمان تھے جوہر

جو حاکموں کی زباں تھی اسے کیا محکوم
زبانِ غیر میں شعلہ بیان تھے جوہر

نپولیَن کی تھی ہمّت، قلم مکالَمے کا
اثر میں برکؔ کی گویا زبان تھے جوہر

جدھر نکل گئے ایک خلق ساتھ لیکے چلے
خود اپنی ذات سے ایک کاروان تھے جوہر

افق پہ لیگ کے اور کانگریس کے بھی ابھرے
جو سب پہ چھا گئے وہ آسمان تھے جوہر

ہوائیں چلتی رہیں، بجلیاں چمکتی رہیں
سفینہ بڑھتا رہا بادبان تھے جوہر

خمیر ارضِ مقدس کا تھا وہیں پہنچے
دیارِ ہند میں تو مہمان تھے جوھر

مولانا محمّد علی جوہر

عظیم شخصیّت

عظیم شاعر

عظیم مُدبّر

عظیم مُقرّر

عظیم صَحافی

عظیم اِنسان

عظیم مُسلمان

اور میرا محبُوب قائد!

عطش مرزا